حالات سعدی

یعنے

شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی رحمۃ اللہ

کی زندگی اور تصانیف کے حال

از منشی احمد حسین خان صاحب بی۔ اے۔

کارخانہ پیسہ اخبار لاہور کے لئے

لکھے گئے

دوسری مرتبہ سنہ ۱۹۰۹ء میں

[illegible]

[illegible]

اے نیک بخت جنس کے راہنما! تو نے جو کچھ لکھا اپنے ہم جنس کی بہبودی اور بھلائی کے لئے لکھا۔ تو نے جو قدم دھرا راہ رضائے حق میں دھرا۔ تو نے حق کے نام پہ جان و مال سے دریغ نہ کی۔ تو نے ذاتی طمع کو یکقلم دل سے نکال دیا

پھر کیونکر نہ سمجھے خلائق کا اوتار انسان صورت

فرشتہ

سیرت - مجمع محاسن

و کمالات کہوں۔ ذرا اپنا مبارک قدم

آگے بڑھا تا کہ میں بوسہ دے کر دل کو ٹھنڈا کروں اور

اپنا دست شفقت میرے سر پر پھیر اور خدا سے دعا کر کہ میرے ان

اوراق پریشان کو قبولیت کا اعزاز حاصل ہو۔

لاہور

۲۲ ستمبر [illegible]

احمد حسین خاں
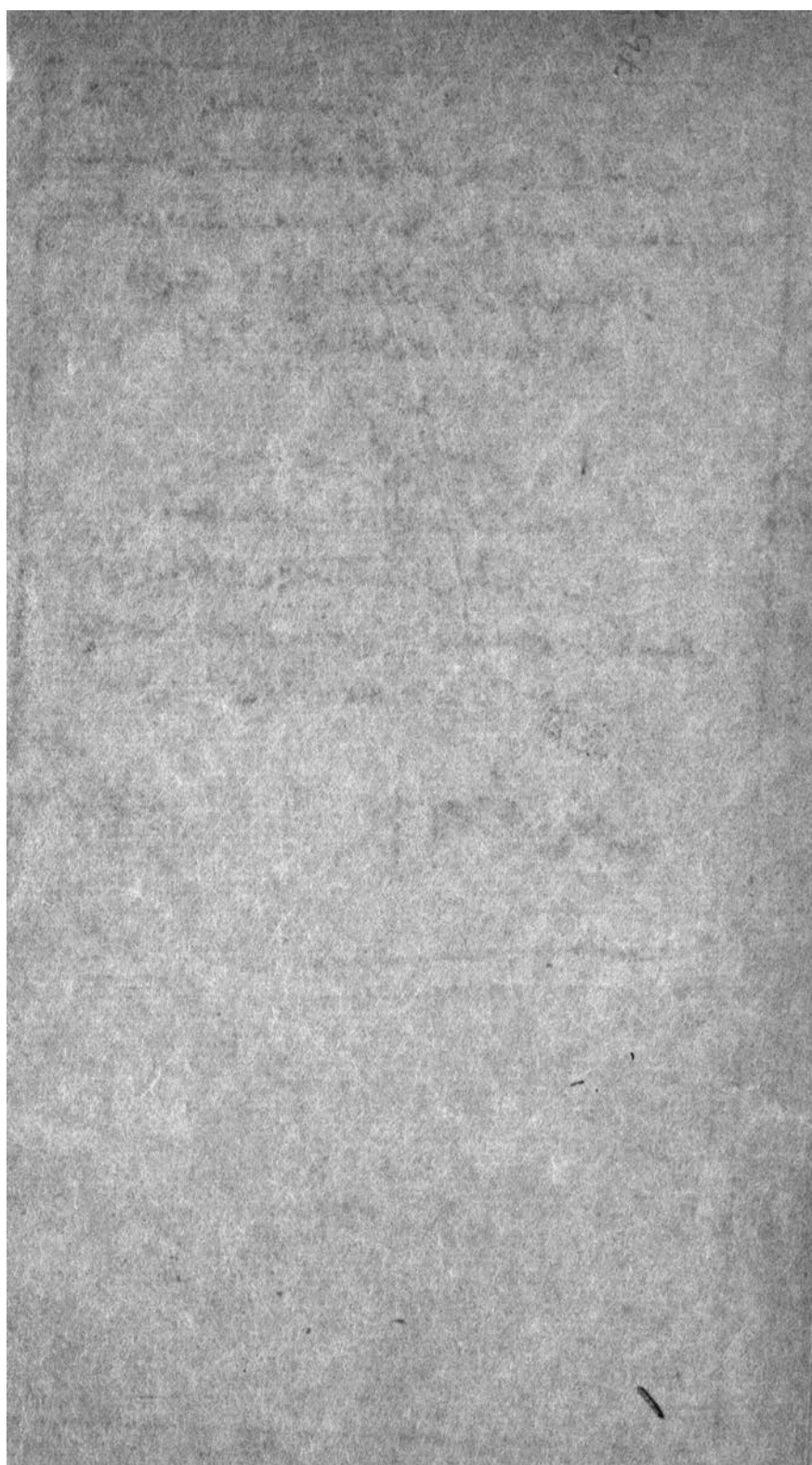
پہلا باب

سعدی کی پیدائش اور بچپن

ایران کی قدیم دارالخلافت شیراز میں جسے مدینۃ العلم کے لقب سے ملقب کرتے تھے جہاں علم و فضل کی کسی زمانہ میں وہ روشنی تھی جو بہت کم ملکوں کو نصیب ہوئی جس کے بانی کی کلاہ عزت میں مسلمانوں میں سب سے اول ہندوستان پر لشکر کشی کا طرہ زرین ہوا۔ جسکی نسبت لسان الغیب نے فرمایا ہے ؎

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکناباد و گلگشت مصلےٰ را

جسکی عمارت کی شان میں اُس عالی دماغ نے جو بقول نادر [illegible] شعر [illegible] بمصداق ذیل شعر کہا ہے ؎

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

پیغمبر سخن، امام تصوف، [illegible] جذبات کا دریا، خیال کا [illegible]

سرچشمہ۔ میدانِ نظم کا غازی۔ عرصۂ نثر کا شہسوار۔ بلاغت اور فصاحت کے اکھاڑہ کا پہلوان۔ مجلس پند ناصح کا صدر۔ انجمن محفل نشاط کا ساقی۔ بزم طفلان کا کھلونا۔ مدرسہ نظامیہ کا فخر۔ ابوبکر بن سعد زنگی کی سلطنت کی یادگار ۵۷۱ھ میں عالم ارواح سے کشور اجسام میں آیا۔ اس کا نام شرف الدین اور لقب مصلح الدین اور تخلص سعدی ہے۔

ٹی جانسن ایسبری لکھتے ہیں کہ شیخ ۵۷۱ھ ہجری میں قصبہ طاؤس میں پیدا ہوا جو کسی زمانہ میں شیراز سے چار فرسنگ کے فاصلہ پر جانب شرق واقع تھا اور تیمور کے حملہ آوروں کی زد و شقیوں سے نیست و نابود ہوگیا۔

مشہور اساتذہ کا یہ قاعدہ تھا کہ جو تخلص اختیار کرتے تھے وہ کسی نہ کسی نام سے نسبت کرتے تھے۔ چنانچہ مصنف شاہنامہ کا والد باغبان تھا اس رعایت سے اس نے اپنا تخلص فردوسی رکھا۔ عرفی شیرازی کا باپ عہدہ عرف پر ممتاز تھا اس لئے اس کا تخلص عرفی ہوا اور اسی طرح شیخ علیہ الرحمۃ نے ابوبکر بن سعد کی نوازش کرنے کے لئے اپنا تخلص سعدی قرار دیا۔

روایت ہے کہ جب شیخ علیہ الرحمۃ پیدا ہوئے تو حضرت خواجہ خضر ان کے والد عبداللہ شیرازی کی خواب میں آئے اور تاکید کی کہ اس مولود کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہو کیونکہ یہ باغ سخن میں ایسے ایسے گل کھلائیگا جن کی خوشبو شہرت عام بن کر تمام جہان کے دماغ کو معطر بنائے گی جسکی بقائے دوام ہمیشہ طراوت بخشتی رہیگی اور جن کی سرسبزی اور شادابی کو ہرگز پژمردگی کا کھٹکا نہ پہنچیگا۔

خواجہ خضر علیہ السلام عالم رؤیا میں تشریف لائے ہوں یا نہ لائے ہوں ہمیں اس سے کچھ غرض نہیں مگر اس میں کسی کو کلام نہیں کہ اس صاحب کمال استاد کا کلام تو شہرت پا کر آب زمزم کی طرح دور دور ملکوں میں گیا اور جہاں گیا [illegible] اپنے [illegible] میں جگہ دی [illegible]

اُڑ گئی اور پیالہ چور چور ہو گیا۔ لات کے لگتے ہی وہ شخص غائب ہو گئے۔ یہ حضرت
ابھی وہاں تھا کی آنکھیں کھلیں اور جو شراب زمین پر گر پڑی تھی چاٹ لی۔ شراب
چاٹتے ہی اسرار شاعری و حقیقت الہی کے دروازہ اُن پر کھل گئے ۔

اس قسم کی روایات شیخ علیہ الرحمۃ کی نسبت بھی مشہور ہیں۔ چاہے ان پر
کوئی اعتبار کرے یا نہ کرے ۔

شیخ کے خاندان کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ بعض محققوں کا قول ہے
کہ سعدی کا خاندان یعنی تھا یعنی اس کے بزرگ چین سے شہزادہ فیروز شاہ کے ساتھ
جب وہ عہدہ ناظم اصفہان ہو کر آیا تھا آ کر شیراز میں آباد ہو گئے ۔

جلال الدین بغدادی نے اپنی کتاب حالات سعدیہ میں لکھا ہے کہ شیخ کا
خاندان دراصل عربی تھا یعنی شیخ نے خود اُن سے فرمایا کہ میں بھی عرب ہوں اور
میرے حسب و نسب کا سلسلہ نبی کی صاحبزادی بی بی فاطمہ سے ملتا اس سے
ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا خاندان فاطمی تھا۔ چنانچہ بقول مصنف حالات سعدی
شیخ کے بزرگ ہاشمیان عرب کے ساتھ اس ملک میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ اور پھر
ایران کی آب و ہوا اُن کو ایسی بھائی کہ یہیں ڈنڈا ڈیرا ڈال دیا۔ غرض شیخ کی
نجابت و شرافت خاندان ہر طرح سے ظاہر ہے ۔

شیخ عبد اللہ شیرازی والد شرف الدین ایک مولوی آدمی تھا جس کی پرہیزگاری
اور تقویٰ عابدی بہت مشہور ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ واقعی ایسا
ہی تھا کیونکہ اس نے بچپن ہی میں نماز و روزہ کے مسائل شیخ مرحوم کے دل
میں نقش کر دیئے اور چھوٹی ہی سی عمر میں اسکو عابد اور شب بیدار بنا دیا۔ جس
طرح عرب کے عبد اللہ نے اُمی پیغمبر کے دل کو روحانی طاقتوں یعنی فرشتوں نے
نور کے پانی سے دھو کر صاف کیا تھا اسی طرح شیراز کے عبد اللہ نے اپنے نور عین کی
طبیعت کو جو کچھ سونا تھی ادب و تربیت کی کٹھالی میں ڈال کر جلا کر کے کندن
پاک و صاف نہ کرتا [illegible] کہ صحبت بد ہی بگاڑ دیتی ہے ۔

جیسا کہ شیخ مرحوم نے فرمایا ہے ؎

با بداں کم نشیں کہ صحبت بد
گرچہ پاکی ترا پلید کند

کمال اور شیخ عبداللہ نے یہ کیا کہ وہ سعدی کو کبھی اپنے پاس سے جدا نہ کرتا تھا اور ہمیشہ اسکے اقوال اور افعال کا نگران رہتا تھا۔

شیخ عبداللہ کی تنک مزاجی مشہور تھی اور شیخ علیہ الرحمۃ کا تو اُس سے خون خشک ہوتا تھا کیونکہ وہ ذرا سی بات بھی زجر و توبیخ سے نہ چوکتا۔ چنانچہ شیخ کی ابتدائی تربیت کے تذکرہ کو لکھا ہے شیخ عبداللہ شیرازی کے ہی رنگ سے بھرا ہے اور سعدی نے بوستان میں خود اس امر کو ان ابیات میں تسلیم کیا ہے ؎

ندانی کہ سعدی مکاں از چہ یافت
نہ ہامون نوشت و نہ دریا شکافت

بخردی بخورد از بزرگان قفا
خدا دادش اندر بزرگی صفا

شیخ عبداللہ کی تلخ مزاجی اور اُس کی شیخ کو بے موقع زجر و توبیخ کرنے کی تائید گلستان کی ایک حکایت سے بھی ہوتی ہے کہ ایک دن شیخ سعدی اپنے والد کے ساتھ ایک خانقاہ میں بیٹھے ہوئے عبادت کر رہے تھے۔ جب آدھی رات ہوئی تو سوائے شیخ عبداللہ اور سعدی کے سب سو گئے اور کوئی بھی نیند پر غالب نہ آسکا۔ یہ حال دیکھ کر سعدی نے اپنے والد سے کہا کہ اُس تماش کے یہ سب عجب شخص ہیں کہ ایسی نیند میں پڑے ہیں۔ گویا نیند کو عبادت خدا سے بہتر سمجھتے ہیں۔ کاش خدا ان کو ہمارے جیسی ہدایت دیتا۔ یہ سُن کر عبداللہ سخت ناراض ہوا اور کہنے لگا کہ تو اپنی عبادت پر نازاں ہے اور اپنے آپ کو اُن سے بہتر سمجھتا ہے پس معلوم ہوا کہ تو دکھاوے کی عبادت کر رہا ہے۔ بہتر ہے کہ تو بھی سو جا اور اپنی عبادت پر رو۔ آخر شیخ نے درحقیقت اپنے قصور کا اعتراف کیا اور آئندہ کے لیے توبہ کی۔ چنانچہ اس موقع پر سعدی نے لکھا ہے ؎

نہ بیند مدعی جز خویشتن را
کہ دارد پردۂ پندار در پیش

گرت چشم خدا بینی ببخشند   نبینی ہیچ کس عاجزتر از خویش

مگر شیخ علیہ الرحمۃ کا والد اسکو کم سن چھوڑ کر مرگیا اور ایسے لایق و قابل باپ کا سایہ جلد اس کے سر سے اٹھ گیا ۔

شیخ عبداللہ شیرازی کے مرنے کے بعد اس کے ماموں علامہ قطب الدین شیرازی نے جو محقق طوسی کا شاگرد رشید اور ہولا خاں کا مصاحب خاص تھا اس دُرِ یتیم کی پرورش کا بیڑا اٹھایا مگر بعض تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا بلکہ والد کی وفات کے بعد اسکی تربیت اور پرورش صرف اسکی بیوہ ماں نے کی ۔

اگرچہ شیخ عبداللہ شیرازی شیخ کے جوان ہونے سے پہلے ہی مرض قلب سے راہی ملک بقا ہوا ۔ شیخ کی والدہ ماجدہ مسماۃ ناظمہ ایک رئیس ایران کی بیٹی تھی جو بڑی نیک بخت لایق عورت تھی ۔ اپنے خاوند سے کچھ عرصہ بعد فوت ہوئی اور شیخ ہمیشہ اسکی قدر و منزلت کیا کرتا تھا اور ہمیشہ پیار سے کہا کرتا تھا کہ اماں جان میں وہی ہوں جو تمہاری آغوش میں بیچاروں کی طرح پڑا رہا کرتا تھا اور تم مجھے تھپک کر سُلایا کرتی تھیں ۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جوش جوانی میں شیخ نے اپنی والدہ ماجدہ کی خدمت میں کچھ گستاخی کی اسکی والدہ رو کر کہنے لگی ۔ معلوم ہوتا ہے تجھکو بچپن کا زمانہ یاد نہیں رہا کہ مجھ بیوہ پر سختی کرتا ہے ۔ یہ سن کر شیخ کے شیر دل پر ٹھیس لگی اور پاؤں پڑ کر قصور معاف کرایا ۔

اسکی والدہ درویش مزاج ۔ پابند زہد و عبادت اور صلاح و تقوی تھی ۔ اور شیخ سے نہایت سختی سے فرائض مذہب کی تکمیل کراتی تھی ۔ غرض والدین کی نیک تربیت نے صلاح اور تقوے کی چاٹ ایسی لگائی تھی کہ اسکی کوئی کسی مخالف انقلاب سے زائل نہ ہوئی اور اس کے عادات و اطوار میں اخیر تک سر مو فرق نہ آیا ۔ اس میں کچھ کلام نہیں کہ شیخ علیہ الرحمۃ فطرتاً شریف اور نیک فطرت تھا مگر پھر بھی نیک والدین کی نیک تربیت نے اُس کو صحبت کے اثر سے بچا

وہ ایک سیف خریدہ تھا۔ جس پر اس کے والدین کی تربیت نے تمدن بات کا کام کیا۔

شیخ عبد اللہ شیرازی کی نسبت چند تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ وہ شاہی ملازم تھا مگر جہاں تک ہم نے چھان بین کی ہے ہمکو یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ ہرگز نوکری کرنا نہ چاہتا تھا۔ وہ ایک تارک الدنیا شخص تھا۔ اور اس کو سلطنت کے عہدوں اور سرکاری ملازمت سے کچھ سروکار نہ تھا۔ اس طرح اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ مظفر الدین تکلا بن زنگی نے جو شیخ عبد اللہ کا بڑا معتقد تھا۔ ہرچند چاہا کہ شیخ عبد اللہ کو مشیر سلطنت کر دے۔ اور وزیری کا خلعت دے مگر اس نے منظور نہ کیا۔

شاہد سعدی لکھتا ہے کہ عبد اللہ نے پہلے حضرت مصلح الدین کے ہاتھ پر کی تھی۔ یہ شخص اُس زمانہ میں دینی اور دنیوی علوم میں علمار وقت کا سرتاج سمجھا جاتا تھا اللہ حاجی۔ حافظ۔ صوفی۔ شیخ زمان اور متقی اول درجہ کا تھا۔ چنانچہ ابھی شیخ علیہ الرحمۃ کی سات برس کی ہی عمر تھی کہ عبد اللہ انکو مصلح الدین کے پاس لے گئے جن کو اس بچہ کی پیاری پیاری باتیں بہت پسند آئیں اور اُسکو گود میں لے کر کہا اے عبد اللہ مبارک ہو کہ خدا نے روشن دل اور خوبصورت بچہ تجھے دیا اور اس کا ظاہر جیسا خوبصورت ہے۔ ویسا ہی اس کا باطن بھی جمیل اور حسین ہے۔ اس کے بعد مصلح الدین نے دونوں ہاتھ اٹھا کر سعدی کو دعا دی اور کہا کہ اس بچہ کو ہر روز میرے پاس لایا کرو۔ اس کے جواب میں عبد اللہ نے عرض کی کہ یہ آپ کا غلام ہے اسے غلامی میں قبول کرئیے۔ مصلح الدین شیخ علیہ الرحمۃ کے حال پر باپ سے بھی زیادہ شفقت کیا کرتے تھے۔ شیخ نے قرآن شریف انہیں سے پڑھ کر حفظ کیا۔ اور انہیں کے نام سے اپنا لقب مصلح الدین رکھا۔ کہتے ہیں کہ گیارہ برس کی عمر میں شیخ نے قرآن شریف حفظ کر کے فراغت حاصل کی۔ اس بات سے ظاہر ہے کہ وہ کس بلا کا ذہین اور تیز طبع

بچپن تھا۔

ٹی جانسٹن ایلبرے صاحب کہتے ہیں کہ شیخ کا بچپن ہومر شاعر کے بچپن
سے مشابہ تھا۔ اور قدرت نے ان دونوں ناموروں کی سرشت میں کچھ ایسی نسبت
رکھ دی ہے کہ ان کا طرز کلام اور مذاق سخن بھی ایک دوسرے سے ملتا جلتا
ہے۔

جلال الدین بغدادی نے شیخ کے بچپن کی نسبت لکھا ہے کہ اس کی عادات
بچپن ہی سے محتاط اور درست تھیں۔ وہ عام بچوں کی طرح کبھی ضد یا خفیف
حرکات نہ کرتا تھا جو اس کے والدین یا کسی بزرگ کی تکلیف دہی کا باعث
ہوں۔ چنانچہ اس کی تمام باتیں خوش آئندہ معلوم ہوتی تھیں اور لوگ اسکو
محبت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

شیخ بچپن ہی سے حاضر جواب تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے اسکو اپنے باپ کے
ساتھ سعد زنگی کے دربار میں جانے کا اتفاق ہوا۔ سعد نے اس ہونہار بچہ
سے دریافت کیا۔ کہ میاں بتاؤ تمہاری عمر کیا ہے۔ سعدی نے نہایت
متانت کے ساتھ جواب دیا کہ حضور کی پر شوکت سلطنت اور اسر سبز راج سے
پورے بارہ برس چھوٹا ہوں۔ سعد زنگی نے اس حاضر جوابی کو نہایت پسند
کیا۔ اور عبداللہ سے کہا کہ تم اس ہونہار کی تعلیم و تربیت اچھی طرح سے کرنا
یہ ایک نہ ایک دن شہرۂ آفاق ہوگا۔

غرض جب شیخ علیہ الرحمۃ نے ہوش سنبھالا تو اس کو تحصیل دنیاوی کا شوق
دامن گیر ہوا۔ اس زمانہ میں اہل علم کی بڑی قدر تھی۔ اور غالباً ان علماء
مشائخ فصحا اور بلغا کی تقلید کے شوق نے اس کی تیزیٔ طبع اور ذہانت
کے شعلہ پر جو قدرت نے اس کی سرشت میں روشن کیا تھا۔ تیل کا کام
کیا۔ اس نے شیراز اور قرب و جوار کے علماء کی صحبت میں نشست
و برخاست شروع کر دی۔ کہتے ہیں کہ اس کی قوت حافظہ اور یادداشت

ایسی زبردست تھی کہ جس چیز کو ایک دفعہ پڑھ لیتا یا سن لیتا تھا وہ اس کو کبھی
نہیں بھولتا تھا۔ مثل مشہور ہے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ اس کی طبیعت
کی براقی اور جودت کے باعث شیراز کے علما بھی جیسے اس کو نظر الفت سے دیکھتے
تھے اور تحسین و آفرین کے انعام اکرام سے اس کے حوصلہ کو جو باپ کے بے وقت
مر جانے سے پست ہو گیا تھا بڑھاتے رہتے تھے۔ پہلے پہل شیخ نے ارادہ کیا کہ
مدرسہ عضدیہ میں جو کہ عضدالدولہ دیلمی نے قایم کیا تھا۔ اپنی تعلیم کو درجہ تکمیل پر
پہنچائے لیکن قسمت کو یہ منظور نہ تھا کیونکہ سعد زنگی اس زمانہ میں عراق کے
حدود پر لشکر کشی کر رہا تھا۔ غیاث الدین بلبن نے میدان خالی پاکر شیراز
کا وہ حال کیا جو سنہ [illegible] میں تیمور گورگانی نے دہلی کا کیا تھا۔ شیراز کی تباہی اور
بربادی اہل شہر کا قتل اور غارت ہونا دیکھ کر شیخ کا بھی دل ڈر گیا اور اس نے
ارادہ بالجزم کر لیا کہ چاہے کچھ ہی ہو ترک وطن کرنا بہتر ہے۔ اور واقعی شیخ نے
بہت اچھا کیا کیونکہ مفسدین شیراز کو اکثر تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے
اور ایسی حالت میں تحصیل علوم کی فرصت شیخ کو وطن میں ملنی دشوار
تھی۔

یہی عضدیہ کالج جس میں کسی زمانہ میں دو ہزار طالب العلموں کی بھیڑ رہا کرتی
تھی۔ جہاں ہیئت۔ ریاضی۔ منطق۔ فلسفہ کی قابل تعریف تعلیم ہوتی تھی۔ ان
دنوں بد قسمتی سے متعصب لوگوں کا زیر مشق ستم تھا۔ جنہوں نے زبردستی
[illegible] علوم کی تعلیم کو یک لخت موقوف کر دیا اور پروفیسروں کو یا تو جبر سے کر
[illegible] کفر کا فتوے شائع کر کے قید اور قتل کر دیا۔ کالج کے کمروں
میں جہاں کسی زمانہ میں علوم کی روح پرور ہوا چلتی تھی۔ کچھ چمگادڑوں۔ [illegible]
اور حشرات الارض کی آندھی چلنے لگی۔

لکھتے ہیں کہ جس وقت شیخ پہلے پہل اس مدرسہ میں گئے [illegible]
صاحب بہشت کے مسئلہ پر بحث کر رہے تھے۔ [illegible]

اور کبھی اپنے پاس سے جدا نہ کرتا۔ یہ مصحف مجید پتھر سے پر سنہری حرفوں سے لکھا ہوا تھا۔ جس قافلہ کے ساتھ شیخ علیہ الرحمۃ قطع منازل کرنیکا ارادہ کرکے روانہ ہوا تھا اس سے ایک ہی منزل پر علیحدہ ہو گیا کیونکہ شیخ کو ایک سخت مرض نے آ گھیرا جس سے وہ کئی دن تک بیہوش ایک گاؤں میں پڑے رہے۔ شیخ کی تیمارداری گاؤں کی ایک عورت کرتی تھی جسکے دلی پر خلوص علاج سے اللہ نے انکو شفا بخشی۔

شیخ بچپن ہی سے عذب البیان اور شیریں زبان تھا۔ جب یہ گاؤں سے رخصت ہونے لگا تو گاؤں والوں کو انکی جدائی کا سخت قلق ہوا۔ انہوں نے شہد۔ پنیر، کباب اور روٹیاں شیخ کو دیں اور کہا کہ ان کو ساتھ لیجاؤ سفر میں کام آئینگی۔ مگر شیخ نے کہا کہ مجھے معاف رکھو میرا بھروسہ توکل پر ہے وہ رزاق جو پتھر میں کیڑے کو رزق دیتا ہے مجھے کسی صورت میں بھوکا نہیں رکھیگا۔ اس قدر بوجھ کے ساتھ مجھے چلنا دوبھر ہو جائیگا۔ سچ ہے ؎

سینکڑوں کوس سے رزق اڑ کے چلا آتا ہے
پر لگا دیتا ہے رزاق مرا دانے کو

سعدی گاؤں سے رخصت ہو کر تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ یکلخت ایک گروہ قزاقوں کا نمودار ہوا جنہوں نے اسکو گھیر لیا اور کہا کہ جو کچھ ہو حوالہ کر دے۔ شیخ نے فوراً اپنی کتابوں کا بستہ ان کے سامنے رکھ دیا اور کہا میں طالب علم ہوں اور جو کچھ میرا مال متاع ہے وہ یہ بستہ ہے۔ اس میں سے جو کتاب تمہارے پسند ہو لے لو اور اپنے بچوں کو پڑھاؤ۔ شیخ کی بھولی بھالی باتوں نے قزاقوں کو گرویدہ بنا لیا۔ انہوں نے بجائے رہزنی کے شیخ کا بستہ اٹھا لیا اور ایک خچر اسکی سواری کے لئے بھی لا دیا اور دو بہادر رہنمائی کیلئے اس کے ساتھ کر دیئے۔

یہ تینوں شخص خوشی خوشی چلے جا رہے تھے کہ دفعۃً آسمان کے میدان پر عناصر سرگرم مصاف ہوئے ہوا اس تیزی سے چلنے لگی کہ درخت جڑ سے

[illegible] وہاں سے گھبرا گئے۔ ناچار تینوں کو ایک درخت کے نیچے ایک غار میں ٹھیرنا
پڑا۔ شیخ قرآن شریف پڑھنے بیٹھ گیا۔ یکایک اس کے دو رفیقوں میں سے ایک
زمین پر گر کر تڑپنے لگا اور تھوڑی دیر میں اس کا جسم جگہ جگہ سے پھٹ گیا
اور اس میں سے نیلا نیلا پانی بہنے لگا۔ سعدی نے اس کو اس عذاب کے
ساتھ مرتے دیکھ کر اپنے دوسرے رفیق سے دریافت کیا کہ یہ کون شخص ہے
اس نے جواب دیا کہ اصل میں یہ اصفہان کے قاضی القضات کا بیٹا ہے صحبت
بد کی بدولت اس نے اپنے باپ کو قتل کیا اور پیشہ قزاقی اختیار کیا۔ یہ شخص بڑا
سفاک ہے سینکڑوں اس کے ہاتھ سے قتل ہوئے مگر اس شخص کی پیشانی
پر بل تک نہیں آیا۔ سعدی نے کہا انسان کو مکافات عمل سے غافل نہیں رہنا
چاہیے۔ یہ سن کر سعدی کا دوسرا رفیق بھی اٹھ بیٹھا اور کہنے لگا کہ یار گناہ تو
میرے ہاتھ سے بھی بہت ہوئے ہیں دیکھیے انجام کیا ہوتا ہے۔ ابھی وہ اپنی
گفتگو ختم بھی نہ کرنے پایا تھا کہ ہوا کے تند اور تیز جھونکے سے جس ڈال کے نیچے
وہ شخص بیٹھا ہوا تھا ٹوٹ کر اس کے اوپر گری اور گرتے ہی دونوں پنڈلیاں اس کی ٹوٹ گئیں
اس اثنا میں وہاں چند خونخوار بھیڑیے آ گئے اور معاً اس کو چیر پھاڑ ڈالا۔ سعدی
یہ سانحہ دیکھ کر ڈر گیا اور اس سے اس کو بڑی عبرت اور نصیحت حاصل ہوئی۔ غرض
جب طوفان کی تندی کم ہوئی تو وہ بغداد کی جانب روانہ ہوا۔

دوسرا باب

شیخ کی علمی استعداد طبعی عادات اور دیگر حالات

(شیخ علیہ الرحمۃ کی تصویر ملاحظہ ہو)

شیخ دراز قامت۔ صحیح المزاج۔ قوی اور جفاکش آدمی تھا۔ اس کا سر بڑا [illegible]

جو بعد از سیاحت کا دیکھا گیا ہے بہت بڑا تھا اسکی پیشانی فراخ اور ہر دو چشم سرمگیں
کے نور سے روشن تھی۔ رنگ سُرخ و سپید میانہ۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ ریش
مبارک مشت بھر۔ مونچھیں گھنی اور لبیں لبی تھیں۔ اس کے چہرہ سے جلال اور
حکمت ظاہر ہوتی تھی اور بشرہ سے رعب وداب برستا تھا۔ شیخ کا سینہ بہت
فراخ تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ یہ عام لوگوں سے زیادہ حوصلہ مند تھا۔ شیخ کا لباس
عموماً قدیم ایرانیوں کا سا ہوتا تھا۔ سر پر کلاہ پیچدار یا بھاری عمامہ۔ گلے
میں عربی یا ایرانی جبّہ۔ اور پاؤں میں شرعی پاجامہ۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ
کبھی رومی کپڑے پہن لیتا تھا اور کبھی یونانی ڈریس۔ اس کا قول تھا کہ
"درویش صفت باش و کلاہ تتری دار"

شیخ چونکہ اکثر سیر و سیاحت میں زندگی بسر کرتے تھے اس لئے ایک ہاتھ میں
کشکول اور دوسرے ہاتھ میں تبر بھی رکھتے تھے۔

شیخ ہمیشہ نئے رنگ بدلتا رہتا تھا اور ہر رنگ میں چمکتا تھا۔ کبھی تو وہ
فقرا اور مشائخ کے حلقوں میں مستانہ دیکھا جاتا تھا۔ کبھی وہ بادشاہوں کے
دربار میں درافشانی کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ کبھی وہ احرار و ابرار کی صحبت میں
مستفیض دکھائی دیتا تھا۔ اور کبھی مندروں اور بت پرستوں میں باتیں کرتا نظر آتا
تھا۔ شراب خانہ میں وہ بیدھڑک چلا جاتا تھا بت خانوں میں رہنے لگتا تو رام
ہو جاتا۔ غرضیکہ یہ بزرگوار عجب معجون مرکب تھا۔ جامع بعلبک میں اس نے
وعظ سنائے۔ سومنات میں پرشاد اس نے اُڑائے۔ فلسطین کی بستیوں میں
سقائی اس نے کی۔ بصرہ کے نخلستان میں کھجوریں اس نے چکھیں۔ غرضیکہ
اس نے اپنی تمام عمر خصائل انسانی اور دنیا کی روزگار کے مطالعہ میں صرف
کردی اور واقعی جس خوبی اور دلکش اسلوبی سے اخلاق بشری کی جو تصویر شیخ
علیہ الرحمۃ نے کھینچی وہ آجتک ہر چند کہ زمانہ سینکڑوں برس آگے نکل آیا ہے اور
اس عرصہ میں بے شمار ترقی ہوئی لیکن کسی سے نہیں کھینچی۔

جب شیخ بے دست و پا، بے یار و مددگار شیراز کو خیر باد کہہ کر بغداد میں پہنچا تو
سب تعلقات کو چھوڑ کر اور سب یار آشناؤں سے منہ موڑ کر دل لگا کر تحصیل
علوم میں مشغول ہو گیا۔ بغداد کے مشہور مدرسہ نظامیہ کی اس وقت دور دور
شہرت تھی۔ گویا یہ اس زمانہ کی کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی تھی۔ یہ مدرسہ
خواجہ نظام الملک طوسی نے ۴۵۹ھ میں بنوایا تھا اور اس مدرسہ کی شہرت
کا یہ عالم تھا کہ جو شخص یہاں سے تحصیل علوم کر کے نکلتا تھا وہ اس زمانہ کا مشہور
معتبر مسلم الثبوت اور سند یافتہ عالم سمجھا جاتا تھا۔ اس مدرسہ میں اہل شیراز
کے ساتھ خاص رعایت کی جاتی تھی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اسکا پہلا مدرس ابو اسحٰق
شیراز کا باشندہ تھا۔ یہ رعایت شیخ کے حق میں از بس مفید ہوئی اور وہ
اسی مدرسہ میں داخل ہو گیا۔ شیخ چونکہ تندرست ذہین تھا، ذہانت، شوق اور
محنت کی بدولت مہینوں میں وہ کام کیا جو کوئی اور شخص برسوں میں مشکل سے
کرتے ہیں۔ شیخ جس کو بچپن سے شب بیداری کی عادت تھی دن رات میں
بمشکل تین گھنٹے سوتا تھا اور ہر وقت مطالعہ کتب میں مشغول رہتا تھا پانی پیتے
میں یہ پڑھتا جاتا تھا۔ کھانا کھانے میں یہ پڑھتا۔ لیٹے ہوئے یہ پڑھتا تھا۔ راہ
چلتے ہوئے یہ کتاب دیکھتا تھا۔ غرضیکہ جس وقت یہ پڑھتا تھا کوئی مطالعہ کرتا
تھا۔ چنانچہ اس نے خود کہا ہے ؎

پئے علم چوں شمع باید گداخت
کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

جب استادوں نے شیخ کی روز افزوں ترقی، محنت اور ذہانت دیکھی تو وہ اسکی
طرف خاص توجہ کرنے لگے۔ اور مدرسہ کے متولی نے اس کا وظیفہ بھی مقرر کر
دیا۔ مدرسہ نظامیہ میں اس وقت حدیث اور تفسیر کا پروفیسر علامہ ابو الفرج
عبدالرحمٰن ابن جوزی تھا جس کی نسبت ایک عجیب حکایت مشہور ہے کہتے
ہیں کہ جب یہ شخص مرنے لگا۔ تو اس نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کو

لایا اور ایک قینچی ان کے حوالے کی۔ اور کہا کہ یہ فلاں مقفل حجرہ کی کنجی ہے جب
میرا مرغ روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے تو اس حجرہ کو کھولنا اس میں
ان ٹھیکروں کا تراشہ بھرا ہے۔ جن سے میں نے حدیث لکھی ہے میرے غسل میت
کے لئے اسی تراشہ کو جلا کر پانی گرم کرنا۔ چنانچہ اسکی وصیت کی تعمیل ہوئی
لیکن وہ تراشہ اس قدر تھا کہ پانی بھی گرم ہوگیا اور پھر بھی بچ رہا۔

یہ پروفیسر شیخ علیہ الرحمتہ کے حال پر نہایت مہربان تھا اور کہا کرتا تھا کہ
سعدی تو ضرور ملک شہرت کو تسخیر کرے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس صاحب
کمال کی صحبت سے شیخ نے بہت فائدہ اٹھایا گلستان میں صحبت نیک کی
تعریف میں ایک موقع پر شیخ نے لکھا ہے ؎

جمال ہمنشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

شیخ کو وجد و سماع کی مجلسوں میں شریک ہونے کا بڑا شوق تھا۔ اور سرود
شیخ کی جان تھا۔ چاہے بارش ہو یا آندھی چلے شیخ وجد و سماع میں شریک ہوئے
بغیر نہ رہتا تھا۔ شیخ ابو الفرج بن جوزی رحمتہ اللہ علیہ جو اس کے مربی تھے اس کو
منع کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بھائی ایسی محفلوں سے احتراز لازم ہے جوانی
کے عالم میں انسان بہت جلد بگڑ جاتا ہے۔ تمہارے لئے یہ بہتر ہے کہ تم خلوت
اور عزلت اختیار کرو۔ مگر شیخ کا ان دنوں عالم شباب تھا۔ اور بقول شخصے کہ
نصیحت صیقل زنگار عشق است۔ جس قدر وہ منع کرتے تھے اتنا ہی اسکا شوق
زیادہ ہوتا تھا۔ کیونکہ طبیعت اس طرف رجوع تھی ایکدن اس کے ایک دوست
کے ہاں قوالی تھی۔ شیخ کے نام بھی رقعہ آیا۔ شیخ نہایت خوش خوش مدرسے
رخصت لیکر وہاں گیا۔ راہ میں جب شیخ ابو الفرج بن جوزی کی نصیحت یاد آئی
تو یہ شعر پڑھ کر دل کو تسلی دی ؎

قاضی ار با ما نشیند بر فشاند دست را   محتسب گر مے خورد معذور دارد مست را

واضح ہو کہ تصوف وہ علم ہے کہ جس میں ذات و صفات باری تعالیٰ کی بابت
بحث کی جاتی ہے تاکہ اصل صانع سے خدا کو حاصل کریں۔ اس کا موضوع ذات
و صفات خداوند تعالیٰ ہے اور اس علم کی غایت یہ ہے کہ اصل صانع سے وصال
اور شغف ہو۔ پس شیخ سے سائل کے سوال کا یہ مطلب تھا کہ وہ کیا چیز ہے
کہ جس سے تصوف ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب شیخ نے یہ دیا کہ تصوف اصل
اصول سے تحقیق ہو سکتا ہے جن سے انسان بظاہر پریشان معلوم ہوتا ہے
مگر باطن میں اُسے جمعیت حاصل ہوتی ہے۔ پھر ساتھ ہی شیخ نے یہ کہہ دیا کہ آجکل
اُلٹا حال ہے۔ یعنی لوگ نمازیں پڑھ کر اور روزہ رکھ کر دکھاوا کرتے ہیں اور خدا کو
دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی خاطر جمع ہے مگر باطن میں پراگندہ خاطر
ہوتے ہیں۔ ایسی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں
تصوف کے خیالات سے اسکا دل اُچاٹ ہو گیا اور اس طرف اسکی چنداں
رغبت نہ تھی مگر یہ خیالات شیخ شہاب الدین سہروردی کی وفات کے بعد اسکے
دل سے اُٹھے۔ جبتک وہ زندہ رہے۔ شیخ مرحوم ہمیشہ اُن کی خدمت میں رہا
شیخ شہاب الدین کی وفات ۶۳۲ھ میں واقع ہوئی۔ یہ شیخ بڑا فاضل
مشہور گذرا ہے اور اُس زمانہ میں لاثانی سمجھا جاتا تھا۔ اس کے مرنے کا شیخ کو
سخت قلق ہوا۔ اور ان کے بعد اسکو کوئی ایسا صاحب کمال نظر نہ آیا جو اُن
کی صفات سے متصف ہو اور جو ان کی طرح اسکے اور شکوک کی تشفی کرے
اور غالباً یہی بڑی وجہ تھی جس سے اس کے دل سے قریب قریب
اہل تصوف کے خیالات دور ہو گئے تھے۔

شیخ کی زیادہ نشست برخاست علامہ ابو الفرج عبدالرحمٰن ابن جوزی کے
پاس تھی اور یہ بھی اسکے حال پر نہایت شفقت اور مہربانی فرماتے تھے
ایک دن کا ذکر ہے کہ شیخ کسی قدر غصہ میں بھرا ہوا ان کے پاس آیا اور کہنے لگا
کہ فلاں طالب علم ہمیشہ میری بدگوئی کیا کرتا ہے مجھ سے [illegible]

اگر وہ باز نہیں آتا تو آپ اُسے منع کر دیں۔ وہ دوچار شخص جو سعدی اس وقت
مجلس میں بیٹھا ہوا تھا اس وقت جوش میں آیا اور کہا کہ علامہ ابن جوزی
خاموش رہے اور سر گریبان میں ڈالے سب کچھ سنا کئے۔ جب اس کا غصہ فرو ہوا
تو کہنے لگے کہ فلاں شخص کیا واقعی تیری بدگوئی کرتا ہے؟ اس نے برابر جواب دیا
واللہ اس میں کچھ کلام نہیں۔ انہوں نے کہا کہ بہتر ہے تم اس کی تعریف اور
توصیف کیا کرو۔ پھر دیکھو کہ بلاشبہ وہ وقت بہت جلد آئیگا کہ وہ خود ہی شرمندہ ہوگا۔ مگر
تم اس سے بدلہ لوگے یا اسکی بدگوئی کروگے تو بہ اتفاق زیادہ وہ ویسے ہی تم
کو اس پر فائدہ بھی ترجیح نہیں۔ پس بہتر ہے کہ تم اسکو ایسی حکمت عملی
سے خوش کرو کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی بچے۔ سعدی نے ان کی نصیحت
کو تسلیم کیا اور ان کے فرمانے کو دل و جان سے قبول کیا۔ اور اسی معاملہ کو اس
نے گلستان میں ایک اور پیرایہ میں بیان کیا ہے ۔

شیخ طالب علمی کے زمانہ سے عذب البیان اور طلیق اللسان تھا۔ کہتے ہیں
کہ اسکی خوش بیانی اور حسن تقریر پر مدرسہ نظامیہ کے طالب علم رشک کرتے
تھے اور اس سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے تھے۔ شیخ جو عالم شباب میں
تھا یہ بات کب برداشت کر سکتا تھا۔ اکثر ان سے لڑتا جھگڑتا رہتا تھا۔ ایک
دن شکایت کے طور پر ابن جوزی کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ میری جادو بیانی
نے میرے سینکڑوں دشمن پیدا کر دیے ہیں۔ میری تقریر دل پذیر سے مدرسہ
کے طالب علم جل بھن کر کباب ہو جاتے ہیں۔ اور رشک اور حسد کے مارے
ہر روز مجھ سے لڑتے ہیں ؎

توانم آنکہ نیازارم اندرون کسے
حسود را چہ کنم کو ز خود برنج درست

اور فلاں شخص تو میرا جانی دشمن ہے۔ یہ سنکر ابن جوزی نہایت برہم
ہوا اور کہنے لگا کہ تو حسد کی شکایت کرتا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ

بدگوئی اور غیبت کرنا بڑا گناہ ہے تم سب گنہگار و شرمسار ہو۔ تو نے غیبت
سے عاقبت خراب کی ہے اور اس نے رشک و حسد سے۔ یہ سنکر شیخ بہت
ساکت ہو کر چلا آیا اور پھر کبھی شکایت نہ کی ۔

شیخ سنہ ۱۱۹۶ء میں مدرسہ نظامیہ میں داخل ہوا۔ اور قریباً تیس سال تک
وہاں داخل رہا یعنی سنہ ۱۲۲۶ء میں مدرسہ سے فضیلت کی دستار زیب سر
کر کے رخصت ہوا۔ مدرسہ نظامیہ میں اگرچہ بڑے بڑے لائق اور فاضل تعلیم
پا چکے تھے مثلاً امام ابو حامد غزالی۔ شیخ عبد القادر سہروردی۔ عماد الدین موصلی
وغیرہ مگر جو قبولیت شیخ مرحوم کے کلام کو اور جو شہرت اس منتخب روزگار
کے نام کو نصیب ہوئی۔ وہ آج تک کسی مصنف کو میسر نہیں ہوئی اور شاید
آئندہ کسی کو میسر ہو۔ ہندوستان میں بچہ بچہ شیخ مرحوم کے نام سے واقف
ہے اور یورپ کی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں شیخ مرحوم کا کلام ترجمہ ہو کر
شائع نہ ہوا ہو۔

کہتے ہیں کہ طالب علمی کے زمانہ میں شیخ نے بعینہ اپنا دستور العمل اُس طریقہ
پر مقرر کیا تھا جسکی تصریح منوں نے اپنے دھرم شاستر میں برہمنوں کی زندگی
کے پہلے حصے کے بارے میں کی ہے یعنی جب شیخ مدرسے سے رخصت ہوا۔ تو اسکی
عمر پچاس برس کی ہو چکی تھی اور اس وقت تک وہ مجرد رہا تھا اور نفسانی لذات
سے سخت پرہیز کرتا تھا سوتا بہت کم تھا اور غذا نہایت سادی اور معمولی کھاتا
تھا۔ ورزش بہت کرتا تھا۔ اور کبھی کوسوں پیدل [illegible] تھا۔ ان نیک
عادتوں کے باعث اُس نے طبعی عمر حاصل کی اور بڑھاپے میں اس کے قویٰ
ایسے مضبوط اور درست تھے کہ جوانوں کے بھی نہیں ہوتے۔

انقلاب زمانہ کو ملاحظہ کیجئے۔ ایک وقت وہ تھا کہ جب اس مدرسہ کی یہ
شان تھی کہ علم سے بھی بلند تر [illegible] طالب علمی
میں گذرا [illegible] وہ ایک ویرانہ ہے کہ [illegible]

بستا نہیں ملتا یا بعد جاتا ہے اور وہ عمر جو لڑکپن و تنزل میں صرف تحصیل علوم کے
لیے مخصوص ہوتی تھی اب وہ قسمت سے کسی کو نصیب ہوتی ہے۔

شیخ علیہ الرحمۃ کی کم خوری اور اعتدال کی تائید اُس کے کلام سے بھی ہوتی
ہے اُس نے گلستان میں اسی بارہ میں لکھا ہے ؎

اندرون از طعام خالی دار تا درو نور معرفت بینی
تہی از حکمتی بعلت آں کہ پُری از طعام تا بینی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص نے کہا کہ یار تم خود صبر کر کے کیوں
نہیں کھاتے۔ جو سامنے ہو اسے خواہ مخواہ بھوکے مرتے ہو۔ جس قدر تم
کھاتے ہو اگر ہم کھائیں تو شاید ہمیں نیند بھی نہ آئے۔ اس کے جواب میں
شیخ علیہ الرحمۃ نے مسکرا کر یہ شعر پڑھا ؎

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است
تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

اس شخص نے کہا یار ہم سے تو بھوک پیاس مطلق برداشت نہیں ہو سکتی
ہمارا یہ اصول ہے کہ بھوکے رہنے سے سیر ہو کر مرنا بہتر ہے۔ شیخ نے کہا یہ
تمہاری سراسر غلطی ہے۔ اول تو خدا کا فرمان ہے کہ کم کھاؤ۔ چنانچہ قرآن شریف کی
نص قرآنی سے یہ بات متحقق ہوتی ہے۔ اور دوسرا یہ کہ آزما کر دیکھ لو۔ جو شخص کم
کھاتا ہے وہ بیمار نہیں پڑتا۔ کیا تم نے خراسانی درویشوں کی حکایت نہیں سنی
اس شخص نے کہا فرمائیے وہ کیونکر ہے۔ شیخ نے کہا کہ دو درویش خراسانی
ہم سفر ہو نکلے۔ ایک اُن میں دو دن کے بعد کھانا کھاتا تھا اور دوسرا دن
میں تین دفعہ۔ اتفاقاً ایک شہر میں ان کا گذر ہوا۔ وہاں اُنہیں کسی نے جاسوسی
کی تہمت لگائی۔ بیچارے دونوں گرفتار ہو گئے۔ اور بادشاہ کے حکم سے ایک
کمرہ میں بند کر دئے گئے۔ اور اس کا دروازہ اینٹوں سے چن دیا گیا
ایک ہفتہ کے بعد معلوم ہوا کہ یہ بیچارے بے گناہ ہیں۔ چنانچہ فوراً اُن

نے دانی کا علم ہوا۔ اگرچہ بیان گھبرا گیا تو وہ چونکہ قدم کو حد سے بڑھا چکا تھا
لیکن کم خور صحیح و سالم تھا۔

چوں کم خوردن طبیعت شد کسے را ۔ چو سختی پیش آید سہل گیرد
وگر تن پرور است اندر فراخی ۔ چو تنگی بیند از سختی بمیرد

کم کھانے کی شیخ علیہ الرحمۃ نے گلستان کے تیسرے باب میں بھی بڑی تعریف
کی ہے۔ چنانچہ منجملہ حکایات کے ایک حکایت یہ بھی لکھی ہے کہ ایک عجمی
بادشاہ نے ایک حکیم حاذق کو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی خدمت میں ارسال کیا اور کہلا بھیجا کہ اس سے خدمت لی جائے
کہ جس مرض کا علاج کسی کو نہ آتا ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ کرے گا۔ اور
سوائے مرض موت کے تمام امراض بیخ و بن سے اکھاڑ دے گا۔ حکیم صاحب
بہت عرصہ عرب میں رہے۔ مگر کبھی کسی نے ان سے درد سر کا نسخہ بھی
نہ لکھوایا۔ ناچار حکیم صاحب رسول مقبول کی خدمت میں گئے۔ اور شکایت
کی کہ مجھ سے کوئی خدمت نہیں لی جاتی۔ آں حضرت نے مسکرا کر فرمایا۔
کہ تیری آپ کی ضرورت یہاں والوں کو بہت کم پڑے گی۔ اس لئے کہ یہ
لوگ تاوقتیکہ خوب بھوک نہ لگے۔ کھانے پر نہیں بیٹھتے اور ابھی بھوک باقی ہوتی
ہے کہ کھانے سے اٹھ بیٹھتے ہیں۔ اس لئے بیمار نہیں ہوتے۔ پس جب تک
یہ تندرست رہیں تو حکیم کی انہیں کیا ضرورت ہے۔ حکیم صاحب نے یہ
بات تسلیم کی اور عجم کو واپس ہوئے۔

فرشتہ خوئے شود آدمی بہ کم خوردن
وگر خورد چو بہائم بیوفتد چو جماد

سائکلو پیڈیا برٹینکا میں یہی لکھا ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں شیخ
علیہ الرحمۃ نہایت پرہیزگار اور کم خور تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی بیمار نہیں ہوتا
تھا اور ہمیشہ چاق چوبند رہتا تھا۔

اگرچہ شیخ بلا کا خوش بیان تھا مگر اُس کے کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ
خاموشی کو نہایت پسند کرتا تھا اور جب تک ضرورت نہ ہوتی ہرگز کلام نہ کرتا تھا
شیخ مرحوم ایک صاحب بصیرت آدمی تھا اس نے اپنی تمام عمر خصائل انسانی
اور نیرنگی زمانہ کے مطالعہ میں صرف کی۔ اس نے حوادثات و واقعات روزگار سے
ایک عمدہ سبق حاصل کر لیا تھا اور اسکے دل میں یہ بات جم گئی تھی کہ ابنا جنس
کی خیراندیشی اور نصیحت۔ قوم کی دلسوزی۔ بادشاہوں کی اصلاح۔ رعایا
کی ہمدردی سے بہتر کوئی شے نہیں ہے چنانچہ اُس نے اس عزم کو کامیابی
کے ساتھ انجام دیا اور اپنے قلم اور شعر کو ہر طبقہ کے لوگوں کی بھلائی کے
لئے وقف کر دیا۔ حسن اتفاق سے شیخ کو ایسے ایسے موقعے اور ایسے ایسے
اتفاق جمع ہو گئے کہ جن سے اسکی ذاتی قابلیت کو اپنے جوہر دکھلانے کا پوری
طرح موقع ملا۔ اول تو وہ دار العلم میں پیدا ہوا جو ایک مردم خیز خطہ تھا۔ دوسرے یہ کہ
اُسکی یتیمی اسکی ترقی اور رشد کا باعث ہوئی۔ کیونکہ یتیمی کی حالت نے اُسے
خودمند اور جفاکش بنا دیا۔ تیسرا یہ کہ خوبی قسمت سے جس مدرسہ میں وہ داخل
ہوا۔ وہ کل مدارس اسلامیہ میں منتخب اور ممتاز تھا۔ چہارم یہ کہ اُس کو
ایسے ایسے صاحب کمال عالموں اور حکیموں کی صحبت میں نشست برخاست
نصیب ہوئی۔ جو اپنی نظیر آپ ہی تھے۔ مثلاً علامہ ابن جوزی۔ شیخ شہاب الدین
سہروردی۔ خواجہ نصیر الدین طوسی۔ مولینا جلال الدین رومی۔ قاضی ابن خلکان
علامہ قطب الدین شیرازی وغیرہ۔ جہاں کہیں وہ گیا وہاں کے علماء
مشائخ اور کاملین سے ملا۔ ایسی ایسی عمدہ صحبتوں کا میسر آنا بھی ہر ایک کے
نصیب میں نہیں ہے۔ پنجم یہ کہ اُس نے دور دراز کے سفر اختیار کئے۔ اور
دنیا کے عجائبات اور قدرت کی نیرنگیاں دیکھ کر ایک وسیع تجربہ حاصل کیا۔
ششم یہ کہ اس نے سلطنتوں کے پے در پے انقلابات اور ملکوں کے تغیرات
مشاہدہ کئے۔ لاکھوں آدمی اس کے دیکھتے دیکھتے بن گئے اور کروڑوں بگڑ گئے

[illegible] کیا گیا کہ شعرا پر سب انسانوں میں ضرور ہوتا ہے [illegible] اور [illegible] کی
صحبت سے پرہیز کرنا چاہئے۔ سعدی نے جواب دیا کہ آپ نے شاید لقمان کا
قول نہیں سنا کہ کسی نے اس سے پوچھا تھا کہ تو نے ادب کس سے سیکھا
لقمان نے جواب دیا ہے بے ادبوں سے۔ جو بات مجھے ان کی پسند نہ آئی وہ
میں نے چھوڑ دی اور اس سے پرہیز کیا۔ چنانچہ میرا بھی یہی اصول
رہا ہے

تمتع ز ہر گوشہ یافتم
ز ہر خرمنے خوشہ یافتم

شیخ نے خیرات لینے میں کبھی عذر نہیں کیا جب کبھی کوئی اسے کچھ دیتا
تھا وہ خوشی سے لیتا تھا۔ مگر خیرات یا زکوٰۃ جمع کرنے کے لئے یا صرف اپنا ہی
پیٹ پالنے کے لئے نہیں لیتا تھا اس سے اوروں کو بھی فائدہ پہنچتا
تھا۔ ایک دن اس سے ایک شخص نے سوال کیا کہ خیرات کی روٹی کے بارہ
میں آپ کی رائے کیا ہے جواب دیا کہ اگر دل جمعیت خاطر کے لئے لیجائے
تو حلال ہے اور اگر مال جمع کرنے کے لئے لیجائے تو حرام ہے

نان از برائے کنج عبادت گرفتہ اند
صاحبدلاں نہ کنج عبادت برائے نان

شیخ کی طبیعت میں اگرچہ خاکساری بہت تھی۔ مگر وہ خودداری حفظ مراتب
اور پابندی وضع کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ ایک دفعہ اسکندریہ میں سخت
قحط پڑا۔ اس آفت ارضی و سماوی میں جو سختی درویشوں پر گزری اس کا ذکر
ناگفتہ بہ ہے قحط کیا تھا ہر گھر محشر تھا۔ ایک ایک روٹی ہزار ہزار دینار کو
بک گئی۔ اس زمانہ میں شیخ اسکندریہ میں تھا اور طرح طرح کی مصیبتیں اٹھاتا
تھا اسی شہر میں ایک خواجہ سرا تھا جو نہایت دولتمند تھا اسکے مال سے بھوکوں
اور پردیسیوں کو کھانا اور نقدی ملا کرتی تھی۔ شیخ کے رفقا اس کے پاس

آئے اور اس سے کہا کہ چلو اُس مخنث کی دعوت میں چلیں۔ مگر شیخ نے انکار کر دیا اور کہا کہ شیر بھوک کے مارے مر بھی جائے۔ لیکن کتے کا جھوٹا کبھی نہیں کھاتا
بیت ~

دو ناں از دست دوناں چناں باشد سناں خوردن
سناں در سینہ خوردن بہ کہ از دوناں دو ناں خوردن

شیخ کی طبیعت حُسن پرست بھی بہت تھی کیونکہ خوبصورتی تندرستی کی علامت ہے اسلئے وہ خوبصورت آدمیوں سے بہت محبت و پیار کرتا تھا۔ ایک دن وہ اپنے حجرہ میں بیٹھا چراغ کی روشنی میں مطالعہ کتاب کر رہا تھا۔ کہ اُس کا ایک دوست جو یوسف جمال اور خجستہ خصال تھا ان سے ملنے کے لئے آیا۔ سعدی اسکو دیکھ کر جامہ سے باہر ہو گیا اور فوراً تعظیم کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر اُٹھنے میں اُسکی آستین سے چراغ گل ہو گیا۔ سعدی نے کہا مرحبا خوش آمدید کے بعد اُسے تپاک سے بٹھایا اور اُس کے آنے پر بہت مسرت ظاہر کی۔ شیخ کا دوست بیٹھ گیا۔ لیکن اُسے خیال پیدا ہوا۔ شیخ نے دانستہ چراغ گل کر دیا ہے۔ اسلئے آزردہ ہوا اور کہنے لگا تو نے چراغ کیوں بجھا دیا۔ سعدی بھی تھا حاضر جواب۔ کہنے لگا میاں خفا نہ ہو۔ دیا بڑھانے کے دو سبب ہیں۔ ایک تو آپ کے آنے سے میں نے سمجھا کہ آفتاب طلوع ہو گیا اور دوسرا یہ کہ مجھے یہ قطعہ یاد آگیا ~

چوں گرانی بہ پیش شمع آید خیزش اندر میان جمع بکش
ور شکر خندہ ایست و شیریں لب آستینش بگیر و شمع بکش

گلستان کے تیسرے باب میں سعدی ایک جگہ کہتا ہے کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جوانی کے عالم میں ایک کوچہ میں میرا گذر ہوا۔ اندنوں میں گرمی کا عالم تھا کہ چیل انڈا چھوڑتی تھی اور حدت آفتاب سے ہرن کالے ہوئے جاتے تھے۔ اور پیاس کے مارے میرا حال غیر تھا۔ زبان پر کانٹے پڑے ہوئے تھے اور ہونٹ سوکھ گئے تھے میں لاچار ہو کر ایک مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا اور

پانی مانگا تھا۔ یہی دریچہ میں ایسی صورت پانی لیکر آئی کہ اگر آدھی رات میں لب بام پر جاتی تو لوگوں کو گمان ہوتا کہ آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک شربت کا پیالہ تھا جس میں گلاب کا عرق پڑا ہوا تھا۔ مجھے یہ خیال ہوا کہ اسکے گل رخسار پسینے کا کوئی قطرہ شربت میں ٹپک پڑا ہے جس سے معطر ہو گیا ہے۔ میں نے شربت کا پیالہ اس کے ہاتھ سے لیکر پیا اور دوبارہ زندگی ملی ؎

خرم آں فرخندہ طالع کہ چشم
بر چنیں روئے فتد ہر بامداد

اسی قسم کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ حسن پرست تھا اس کی طبیعت ایک رنگیلی تھی۔ اور نہایت صبیح کل انسان تھا۔ ایک شخص اس کے ایک دوست نے ایسی حرکت کی جو اسکے خلاف شان تھی اور جسکے باعث سعدی سخت بیزار ہوا قریب تھا جب اس کا غصہ فرد ہوا۔ تو اس نے مفصلہ ذیل اشعار کہے لکھکر بھیجے اور صلح کر لی ؎

نہ ما با در جہاں عہد وفا بود جفا کردی و بدعہدی نمودی
بیکبار از جہاں دل در تو بستم ندانستم کہ برگردی بزودی
ہنوزت گر سر صلح است باز آ کزاں محبوب تر باشی کہ بودی

شیخ مرحوم کی طبیعت میں ظرافت اور مذاق بھی تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ بعد مدت کے ایک دوست سے راستہ میں دو چار ہوا اور زبان شکایت دراز کی کہ افسوس اس مدت میں نہ خود ملے نہ کوئی قاصد یا پیغام بھیجا۔ سعدی نے کہا اگر کہا قاصد نہ بھیجنے کی یہ وجہ ہے۔ کہ میرے رشک نے یہ گوارا نہ کیا کہ قاصد تیرا جمال جہاں آرا دیکھے اور میں محروم رہوں۔

ایک دفعہ خواجہ شمس الدین نے جو شیخ مرحوم کا بڑا معتقد تھا۔ تبریز سے پانسو دینار طلائی نقد اپنے غلام کے ہاتھ شیخ کی خدمت میں ارسال کئے۔ راہ میں غلام

ایک بہت تھوڑے سے دینار خود ہضم کر لیگیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ شیخ چشم پوشی کرے گا اور کچھ نہ کہیگا۔ شیخ نے دیکھا کہ خط میں پانسو درج ہیں اور غلام سامنے ہے تین سو دیتا ہے۔ بجائے رسید یہ قطعہ لکھدیا ؎

خواجہ تشریفم فرستادی و مال — مالت افزوں باد و خصمت پائمال
ہر دینارت سالے عمر باد — تا بمانی سہ صد و پنجاہ سال

ایک مرتبہ خواجہ علاءالدین نے تبریز سے جلال الدین ختنی کو لکھا کہ شیراز میں شیخ سعدی کو ایک ہزار دینار نذر کرو۔ مگر اسوقت جلال الدین کا انتقال ہوچکا تھا اسلئے وہ رقم شیخ علیہ الرحمہ کو نہ ملی۔ شیخ کو جب حقیقت حال معلوم ہوئی تو قطعہ لکھکر علاءالدین کے پاس بھیجا ؎

بنام صاحب دیواں علائے دولت و دیں — کہ دیں بدولت ایام او ہمے نازد
رسید و پایۂ حرمت فزود سعدی را — بسے نماند کہ سر بر فلک برافرازد
مثال داد کہ صدر ختن جلال الدین — قبول حضرت او در اتحفہ سازد
ولیک بر سر او خیل مرگ تاختہ بود — چنانکہ بر ہمہ ابنائے دہر مے تازد
جلال زندہ نماند ای دریغ دنیا — کہ بندگان خداوند کار بنوازد
شیخ مچہ ماند در سرائے ختنی نیز — کہ از سخا ہمہ مردم ہمیں بدیدہ نازد

یعنی میں نے جلال الدین سے آخرت میں بھی عطیہ وصول کرنے کی امید منقطع کردی ہے۔ بھلا اسکو وہاں لوگوں کے استغاثوں سے میری طرف رجوع ہونیکی فرصت کاہیکو ہوگی۔

ایک دفعہ سفر کے تھکے ماندے شیخ مرحوم ایک امیر کے مکان پر گئے وہاں اسوقت شعر و شاعری کی مجلس گرم تھی۔ احباب جلسہ اپنا اپنا کلام سناتے تھے شیخ صاحب سے بھی فرمایش کی گئی۔ شیخ کو اسوقت بھوک سے قافیہ تنگ تھا کہنے لگے بس ایک ہی شعر پر اسوقت اکتفا کرتا ہوں سب نے کہا ارشاد۔ شیخ نے فی البدیہہ کہی ؎

سن گرسنہ خورد نان مرغ نیست

ہیچو غرایم بر در سلطان ذلیل

صاحب خانہ نے اسیوقت کھانا پکانے کا حکم دیا۔ دسترخوان بچھایا گیا اور گرما گرم روٹی

تنوری سے لا رکھی۔ شیخ۔ روٹی پر اس طرح گرے۔ جیسے کئی دن کے بھوکے تھے

میزبان نے کہا۔ جناب ذرا توقف فرمائیے۔ کوفتہ بھن رہے ہیں۔ ابھی آتے ہیں

شیخ صاحب ہنسے اور کہا ~

کوفتہ بر سفرۂ من گو مباش

کوفتہ را نان تہی کوفتہ است

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بادشاہ کشتی میں سوار تھا اور ساتھ ایک عجمی غلام

تھا۔ غلام پہلے کبھی کشتی میں نہ بیٹھا تھا دریا کو دیکھ کر کانپنے۔ رونے اور شور و غل

مچانے لگا کہ بے اختیار۔ اس غلام کی حرکات سے بادشاہ کا سارا لطف کرکرا ہو گیا

فرمایا کہ اسے کسی طرح چپ کرائے۔ اتفاقاً شیخ بھی اس کشتی میں سوار تھے عرض

کی کہ جہاں پناہ اگر ارشاد ہو تو بندہ حکم کی تعمیل کرے۔ بادشاہ نے فرمایا۔ بڑا

احسان ہو گا۔ سعدی نے آدمیوں کو حکم دیا کہ غلام کو پکڑ کر دریا میں ڈال دو

وہاں کیا دیر تھی۔ ملاحوں نے فوراً دریا میں ڈال دیا۔ بادشاہ اور تمام اہل کشتی

حیران تھے کہ یہ کیا کیا۔ غلام جب خوب غوطے کھا چکا تو شیخ نے ملاحوں سے کہا کہ اسکو

کشتی میں اٹھا لو۔ چنانچہ ملاح نے اسکے سر کے بال پکڑ کر اسے کشتی میں کھینچ لیا

جب غلام کشتی پر آیا تو نہ وہ روتا تھا نہ چیختا۔ خاموش ایک کونے میں بیٹھ گیا

بادشاہ نے متعجب ہو کر پوچھا کہ اس میں کیا حکمت تھی۔ سعدی نے کہا کہ

قدر عافیت کسے داند کہ بمصیبتے گرفتار آید

اس حکایت کی نسبت بعض کہتے ہیں کہ اس کشتی میں سعدی خود موجود نہ

تھے لہذا اس نے یہ فرضی حکایت بطور تمثیل لکھی ہے مگر میں نے ایک ایرانی

[illegible] کی زبانی سنا ہے کہ یہ حکیم حضرت ہی تھے شیخ نے اکثر گلستان [illegible]

بوستاں میں اپنی سرگذشت اور اپنے ذاتی تجربے اور جو اتفاقات خود اس کے
درپیش ہوئے دوسروں کے نام سے لکھے ہیں۔ اس سے کسر نفسی مقصود ہے
اگر وہ ان پند و نصائح و نکات و حکمتوں کو خود اپنی ذات سے منسوب کرتا تو وہ
خودستائی سمجھا جاتا۔ علاوہ اسکے ؎

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

شیخ کی علمی لیاقت کی بابت بعض کی یہ رائے ہے کہ وہ دینیات۔ علم سلوک
علم ادب و علم مناظرہ کا فاضل تھا اور وعظ و مطالب میں نہایت مشتاق تھا
مگر فلسفہ اور حکمت میں اُسے بہت کم دستگاہ تھی۔ جن لوگوں کا یہ قول ہے
وہ اپنی تائید میں گلستاں کی پہلی حکایت پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ
شیخ نے راستی اور دروغ کی ماہیت اور اصلیت کو نہیں پہچانا۔ شیخ کا اصول
دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز بالکل غلط ہے۔ سچ کو کبھی [illegible] نہیں
اور اگر سچ سے فتنہ اُٹھے تو وہ سچ ہی نہیں۔ سچ کا کبھی یہ مقصد مدعا و غرض نہیں
ہوتی کہ اس سے فتنہ اُٹھے۔

علاوہ اسکے یہ اشخاص کہتے ہیں کہ سچ کی تعریف یہ ہے کہ کسی شے کو اسکی
اصلی اور حقیقی صورت میں ظاہر کرنا اور کسی شے کو اسکی اصلی اور حقیقی صورت
میں ظاہر نہ کرنا جھوٹ یا دروغ ہے پس اصلیت کو اصلی اور حقیقی صورت میں
ظاہر کرنے سے کبھی فتنہ و شر نہیں اُٹھتا۔ یہ دروغ جسکی بنیاد اصلیت اور
حقیقت پر نہیں ہے کبھی مصلحت آمیز نہیں ہو سکتا نہیں اگر بادشاہ نے بجائے محض
وزیر کے دروغ کو پسند کیا اور راست گو وزیر کے سچ سے ناراضی ظاہر کی تو وہ
بادشاہ عقل سے معذور تھا اگر راستگو وزیر کے سچ پر اعتبار اور عمل کرتا تو نتیجہ یہ ہوتا
کہ مجرم اپنے اعمال کی سزا اور اپنے کیفر کردار کو پہنچتا اور انصاف ہوتا اور کوئی فتنہ نہ
پیدا ہوتا۔ مگر بادشاہ نے دروغ کو ترجیح دی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مجرم بے سزا رہا

و جب سے پیچ نکلا اور [illegible] دل کی التفات میں فرق آگیا۔ جب سیاست شاہی کو
سعدی پر پہنچا اور قاعدہ اخلاق یعنی قانون کی تعمیل نہ ہوئی۔ پس اس دروغ میں
ذرہ بھر بھی مصلحت نہ تھی؛

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک پادری صاحب کھڑے وعظ کرتے تھے۔ اثناء
وعظ میں کہا کہ سعدی کی تعلیم پوچ اور لچر ہے اتفاقاً وہاں ایک مولویصاحب بھی
کھڑے تھے فرمانے لگے کیوں جناب پادری صاحب لچر اور پوچ کس لئے ہے۔
پادری صاحب نے کہا اسلئے کہ اُس نے لکھا ہے کہ دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی
فتنہ انگیز۔ صاف دروغ کو راستی پر ترجیح دی ہے مولوی صاحب نے کہا قبلہ
ایک سوال کا جواب دے لیجئے۔ پھر میں اس معاملہ میں گفتگو کروں گا۔ انہوں نے
کہا فرمائیے مولوی صاحب نے کہا۔ آپ کو ۱۸۵۷ء کا غدر یاد ہے؟ اُن دنوں
میں میں دلّی میں تھا۔ وہاں جب فرنگیوں کا قتل عام ہوا۔ تو ایک انگریز مع
میم ہمارے مکان میں آ پہنچے۔ ہم نے میم اور صاحب دونوں کو دیسی کپڑے
پہنا دئے اور ہم کہا کر انہیں پناہ دی۔ اتنے میں کالے شمشیر بکف فرنگیوں
کو ڈھونڈتے ہوئے ہمارے مکان پر بھی آئے اور پوچھنے لگے۔ یہاں کوئی انگریز
تو نہیں آیا۔ ہم نے کہہ دیا کہ ہم نے تو کسی انگریز کی شکل تک نہیں دیکھی۔ یہ سنکر
وہ چلے گئے اور بیچارے انگریز اور اُسکی میم کی جان بچ گئی۔ اب فرمائیے کہ بندہ نے
اچھا کیا یا بُرا۔ پادری صاحب اپنا سا منہ لیکر رہ گئے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ مثل
درست نہیں۔ مولویصاحب نے ایک بیگناہ انگریز کی جان بچانے کے لئے دروغ
گوئی کی مگر جس نے اس حکایت سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شیخ کے نزدیک جھوٹ
بولنا بُرا نہیں۔ وہ سراسر غلطی پر ہیں۔ شیخ نے کہیں نہیں کہا کہ جھوٹ بولو۔
بلکہ گلستان کے آٹھویں باب میں اُس نے صاف لکھا ہے کہ جھوٹ بولنا بعینہ
مانند اس ضرب کے ہے۔ جس کا زخم اچھا بھی ہو جائے تو بھی نشان نہیں
مٹتا ہے؛
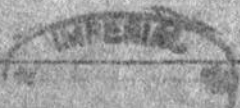
یکے را کہ عادت بود راستی | خطائے رود درگذارند ازو
وگر نامور شد بقول دروغ | دگر راست باور ندارند ازو

گلستان کے باب اول کے عنوان سے ظاہر ہے کہ وہ بادشاہوں کی عادت کے بیان میں ہے اور آداب صحبت میں نہیں ہے۔ یہ حکایت بیان کر کے سعدی نے ایک بادشاہ کی خصلت بیان کی ہے کہ اس نے وزیر نیک محضر کی دروغ گوئی کو واسطے راست باز وزیر کی راستی پر ترجیح دی کہ اول الذکر کی نیت نیکی پر مبنی تھی اور آخر الذکر کی نیت بدی پر تھی یعنی نتیجہ اس حکایت کا یہ ہے کہ بادشاہوں کی نیت دیکھنی چاہیے۔

جہانتک شیخ کی تصنیف اور کلام کو میں نے دیکھا ہے اس میں کہیں بھی دروغ اور کذب کی تعریف نظر نہیں آئی بلکہ شیخ ایک مشہور راست باز اور راست گفتار شخص تھا اور سچی بات کہنے سے کبھی نہ چوکتا تھا۔ چاہے وہ سننے والے کو کڑوی کیوں نہ معلوم ہو۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اباقا خان نے جو ہلاکو خاں کا بیٹا اور چنگیز خاں کا پوتا تھا شیخ سے کہا کہ مجھے نصیحت کرو۔ شیخ نے فی البدیہہ قطعہ پڑھا۔

شہے کہ پاس رعیت نگاہ میدارد | حلال باد خراجش کہ مزد چوپانیست
وگرنہ راعی خلق است زہر مارش باد | کہ ہرچہ میخورد از جزیہ مسلمانیست

اباقا خاں یہ قطعہ سنکر آبدیدہ ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں راعی ہوں یا نہیں؟ شیخ نے بیدھڑک کہا کہ اگر آپ راعی ہیں تو پہلا بیت آپ کے حسب حال ہے ورنہ دوسرا بیت۔

اسی طرح ایک دن شیخ دمشق کی جامع مسجد میں یحییٰ علیہ السلام کی تربت پر معتکف تھا اتفاق سے وہاں عرب کا ایک بادشاہ جو بے انصافی و ظلم میں مشہور تھا آ پہنچا اور نماز سے فارغ ہو کر شیخ کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ مجھے ایک دشمن سخت اور غنیم زبردست کے حملہ کا خوف ہے آپ میرے حق میں

بکریں اور خدا بچائے اس ذلت سے محفوظ رکھے۔ شیخ نے کہا بیچارے غریبوں کو
بیچارہ کمزور بیٹ پر رحم کر اگر زبردست دشمن سے محفوظ ہے ؎

ہر کہ تخم بدی کشت و چشم نیکی داشت
دماغ بیہودہ پخت و خیال باطل بست

ایک دن ایک اور بے انصاف اور ظالم بادشاہ نے شیخ علیہ الرحمۃ سے دریافت کیا کہ کونسی عبادت میرے لئے بہتر اور افضل ہے۔ شیخ نے کہا تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ تو دوپہر تک سوتا رہا کر تاکہ اتنی مدت تک تو خلقت خدا تیرے ظلم و ستم سے بچی رہے ؎

ظالمے را خفتہ دیدم نیم روز گفتم این فتنہ است خوابش بردہ بہ
وانکہ خوابش بہتر از بیداریست آنچناں بد زندگانی مردہ بہ

ان تمام باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ شیخ سچا اور کھرا آدمی تھا۔ وہ جھوٹ سے کوسوں بھاگتا تھا اور سچی بات منہ پر کہہ دیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سچ کہنے میں راحت ہے اس لئے وہ بادشاہ ہو یا وزیر امیر ہو یا نواب۔ کسی سے نہ چوکتا تھا۔ اور صاف صاف منہ پر کہہ دیتا تھا۔ کیونکہ اس کا کیا اس شعر پر تھا ؎

راستی موجب رضائے خدا ست
کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست

شیخ مرحوم بڑا با استقلال آدمی تھا اسپر بڑی بڑی تکلیفیں اور سختیاں گذریں اور اس نے بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں۔ عالم غربت میں اسے تنگی اور عسرت نے بعض اوقات سخت لاچار کیا۔ مگر اس خدا کے بندہ نے دامن استقلال کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ شیخ نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ سفر میں نہ میرے پاؤں میں جوتی تھی نہ جوتی خریدنے کا مقدور تھا میں نہایت بیدل ہو کر کوفہ کی جامع مسجد میں گیا۔ وہاں میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کے پاؤں بھی نہ تھے۔ اسوقت میں نے خدا کا شکر کیا اور ننگے پاؤں ہی غنیمت سمجھے بعض بحر خفیف

سعدی - مجھے آپ کے کام میں ذرہ بھی شک نہیں۔ مگر یہ یاد رہے کہ ملازمت سلطنت میں دو باتیں ہوا کرتی ہیں۔ امید نان اور بیم جان ہے

کس نیاید بخانۂ درویش　　که خراج زمین و باغ بده

یا بتشویش و غصه راضی شو　　یا جگربند پیش زاغ بنه

دوست - افسوس بحث کیا تھی اور آپ کہاں جا نکلے۔ جو شخص نیک نیت اور بے لاگ ہو اور کسی قسم کی خیانت نہ کرے، اسکو کیا خوف ہے۔ داناؤں کا قول ہے کہ چار آدمی چار آدمیوں سے ڈرتے ہیں۔ حرامی بادشاہ سے، چور نگہبان سے، بدکار چغل خور سے اور فاحشہ کوتوال سے۔ جس شخص کا حساب پاک ہے اسکو محاسبہ کا کچھ ڈر نہیں ہے

مکن فراخ روی در عمل اگر خواهی　　که وقت رفع تو باشد مجال دشمن تنگ

تو پاک باش و مدار ای برادر از کس باک　　زنند جامۀ ناپاک گازران بر سنگ

سعدی - یہ سچ ہے مگر دشمنوں کے شر سے کبھی بے خوف نہیں رہنا چاہیے۔ مانا کہ آپ دیانت دار ہیں، بڑے متقی اور پرہیزگار ہیں۔ مگر حاسد ہر وقت کمین میں بیٹھے ہیں۔ جب تک تریاق عراق سے آئے سانپ کے ڈسے ہوئے کا خاتمہ ہو چکتا ہے۔ جب تک تحقیقات ہو دشمن اپنا کام کر جاتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ قناعت کرو اور ہمیشہ توکل پر بھروسہ رکھو

اے قناعت تونگرم گرداں

که ورائے تو هیچ نعمت نیست

دوست - افسوس ہے کہ آپ مجھے ٹالتے ہیں۔ سچ ہے دنیا مطلب کی ہے اب دوستی کا لفظ زبان سے نکالنا [illegible]

[illegible]

دوست مشمار آنکه در نعمت زند　　لاف یاری و برادر خواندگی

دوست آن باشد که گیرد دست دوست　　در پریشان حالی و درماندگی

سعدی نے دیکھا کہ میری نصیحت کارگر نہیں ہوتی تب اس دوست [illegible]
رہا ہے۔ ناچار سفارش کا وعدہ کیا۔ اکثر امرا اور وزرا شیخ کے معتقد تھے اور
اُنکی سفارش کبھی خالی نہ جاتی تھی چنانچہ بہت جلد اس دوست کو ملازمت
مل گئی اور آسودہ حال ہو گیا۔ اگرچہ کچھ شک نہیں کہ بعد از اں وہی ہوا جو
سعدی نے کہا تھا۔ دشمنوں نے بہتان اور افترا پردازی کر کے بیچارہ کو نکلوا
دیا مگر سعدی کی بدولت اُن کا روزگار لگ گیا تھا۔

پس ظاہر ہے کہ شیخ دولتمندوں اور امیروں سے زیادہ تر رفاقت اسی
غرض سے رکھتا تھا کہ اُسکی وساطت سے لوگوں کی مطلب براری ہو حاجتمندوں
کی حاجت بر آئے اور [illegible] الزام ہوں۔

چونکہ سعدی کی وساطت سے امیر و وزیر اہل غرض کی حاجت براری کرتے
تھے اسلئے سعدی ہمیشہ ان کی تعریف و توصیف میں سرگرم رہتا تھا اور اُنکی
شان میں قصاید کہا کرتا تھا اور اگر کوئی ان کو برا کہے تو سعدی اس سے بحث
کرتا تھا۔ ایک دفعہ ایک درویش سے تونگری اور درویشی کے مضمون پر بحث
ہو پڑی اور چونکہ سعدی خود بھی ایک لایق و فایق درویش تھا اس لئے
فریقین سے جو دلائل قاطع و براہین ساطع پیش ہوئیں وہ خالی از لطف نہیں
شیخ مرحوم نے اُن کو ذیل کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میرا ایک محفل میں گذر ہوا وہاں ایک شخص بظاہر
درویش صورت بیٹھا ہوا دولتمندوں کی بیگانگی [illegible] تھا اس درویش نے
جوش میں آکر یہاں تک کہہ دیا کہ فقیروں اور درویشوں کو مقدور نہیں اور
تونگروں اور دولتمندوں میں حوصلہ نہیں ہے

کریماں را بدست اندر درم نیست
خداوندان نعمت را کرم نیست

آپ جانتے ہیں ان بزرگواروں کی نعمت کا نمک پروردہ ہوں مجھے بہت

قیدیوں کو کس طرح رہائی دلا سکتا ہے۔ بس جب یہ بات ہے تو فرشتے [illegible] لوگوں
کا اُلٹا ہے کیا اعتبار۔ اور خداوند تعالیٰ نے قرآن شریف میں اہل بہشت کی تعریف
فرمایا ہے وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ کی تو وہ مثل ہوئی کہ بلی کے خواب میں چھیچھڑے
ہی نظر آتے ہیں ؎

تشنگاں را نماید اندر خواب
ہمہ عالم بچشم چشمۂ آب

میری یہ تقریر سُن کر درویش جامے سے باہر ہو گیا اور زبان زوری کے
توسن باز گھوڑے کو میدان بیحیائی میں دوڑانے لگا۔ بولا کہ تم نے دولتمندوں کی
تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ تیرے چند فقرات پریشان کے
غلو و مبالغہ کی کوئی حد باقی نہیں رہی۔ تیرے نزدیک اہل دولت رزق کے
گھر کی چابی ہیں۔ یہ کیا لغو تقریر ہے۔ بلکہ یہ لوگ مغرور اور متکبر ہوتے ہیں۔ انکی
بات بات سے نفرت ٹپکتی ہے۔ اپنی دولت پر نازاں ہوتے ہیں۔ اور اپنے
جاہ و ثروت پر فریفتہ۔ ان کی یہ بات ہے۔ وہ کمینہ پن کی ہے۔ جس کسی کی طرف
نگاہ کرتے ہیں کراہت اور حقارت کے ساتھ کرتے ہیں۔ عالموں کو اہل اغوی
اور مردہ شو کہتے ہیں۔ اور فقراء کو کنگال کہہ کر طعنہ زنی کرتے ہیں۔ اس
عارضی دولت پر اُن کو اس قدر فخر ہے کہ سب سے بالا اور بلند بیٹھتے ہیں اور
نخوت سے کسی کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھتے۔ یہ لوگ ایسے مغرور کہ داناؤں
کے قول کو خیال میں نہیں لاتے۔ جنہوں نے کہا ہے کہ جو شخص عبادت کی
دولت سے محروم ہے۔ اور دنیاوی دولت سے مالا مال ہے وہ ظاہر میں دولتمند
ہے۔ اور باطن میں فقیر ؎

گر بے ہنر بمال کند کبر بر حکیم
کون خرش شمار اگر گاو عنبر است

میں نے کہا میاں عقل کی دوا کرو۔ یہ لوگ صاحب کرم ہیں کس نے جو بھیا

تو خدا کہتا ہے بلکہ وہ بندۂ درم ہیں۔ ان کی دولت سے کسی کو کیا فائدہ۔ جب
وہ مثل ابر کے ہیں لیکن وہ نہیں برستے۔ اگرچہ آفتاب کے ہیں لیکن کسی کو
روشنی نہیں دیتے۔ باوجودیکہ مقدور کے گھوڑے پر سوار ہیں لیکن یہ حوصلہ
نہیں رکھتے کہ اسکو چلا دیں۔ خدا کی راہ پر ایک قدم بھی نہیں چلتے۔ اور ایک درم
بھی کسی مستحق کو بغیر خوشامد اور احسان و منت جتانے کے نہیں دیتے۔ وہ بڑی محنت سے جمع کرتے
ایسی خست اور کنجوسی کرتے ہیں کہ خدا کی پناہ اور لطف یہ کہ یہ مال و متاع حسرت کے ساتھ پیچھے چھوڑ جاتے
ہیں۔ داناؤں کا قول ہے کہ خسیس کا روپیہ زمین سے اس وقت نکلتا ہے جب
خود خسیس خاک کا پیوند ہو جاتا ہے۔ خسیس تمام عمر اپنے پیٹ کاٹ کاٹ کے جمع کرتا
رہتا ہے۔ اور جب وہ مرتا ہے تو اسکا مال دوسرے بے شفقت اڑاتے ہیں سہ

برنج و سعی کسے نعمتے بچنگ آرد
دگر کس آید و بے رنج و سعی بردارد

میں نے جواب دیا کہ بس آ گئے اپنی اصلیت پر۔ آپ گرتے ہیں۔ آپ کو انکی
نعمت کا کیا دخل ہے۔ بھائی صاحب جو شخص جمع کو یک قلم چھوڑ دے اُس کے
نزدیک کریم اور بخیل یکساں ہیں۔ سچ ہے کہ محک ہی جانتی ہے کہ سونا کیا ہے
اور سائل جانتا ہے کہ خسیس کون ہے۔ میرے مدعی نے جواب دیا کہ میں اپنے
تجربے سے کہتا ہوں کہ دولت مند اپنے غریب خویش و اقارب کو گھر میں
نہیں گھسنے دیتے اور غلیظ اور بے تمیز اشخاص کو دروازہ پر مقرر کر دیتے ہیں
کہ دیکھنا کوئی عزیز یا رشتہ دار نہ آنے پائے۔ اور اگر کوئی بندۂ خدا سائل آ جائے
تو ٹکا سا جواب ملازم کی زبانی دیتے ہیں کہ آپ گھر میں نہیں ہیں اور سچ ہی کہتے ہیں
سہ

آنرا کہ عقل و حکمت و تدبیر و رای نیست
خوش گفت پردہ دار کہ کس در سرای نیست

میں نے کہا کہ بیچارے کیا کریں۔ کہاں تک دیں۔ سائل کسی وقت ان کا

جو دلیل وہ پیش کرتا۔ شیخ مرحوم اسے اپنے منطق کے زور سے رد کر دیتا تھا۔ حتیٰ کہ درویش کا ترکش دلیلوں کے تیروں سے خالی ہو گیا جب درویش شیخ بزرگ کے ساتھ دلیلوں کے زور سے عہدہ برا نہ ہو سکا۔ تو بدکلامی پر اتر آیا۔ اور برا بھلا کہنے لگا۔ شیخ بھی ہر طرح موجود تھا اُس نے ایک کہی تو انہوں نے دس سنا دیں۔ تو خود درویش نے غصہ میں آکر شیخ کا گریبان پکڑ لیا۔ اور ایک جھٹکا دے کر دھجیاں کر دیا۔ شیخ نے اس کے جواب میں اس زور سے [illegible] پر تھپڑ مارا کہ اُس کا منہ پھر گیا۔ اب آگے آگے وہ بھاگتا تھا اور پیچھے پیچھے شیخ سعدی تھے لوگ انکی ہیئت کذائی دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ چنانچہ شیخ نے خود کہا ہے ؎

او در من و من در او فتادہ — خلق از پے ما دواں خنداں
انگشت تعجب جہانے — از گفت و شنید ما بدنداں

القصہ لوگوں نے ان کو علیحدہ کیا۔ اور دونوں اس بات پر راضی ہوئے کہ چلو قاضی کے پاس چلیں۔ جو فیصلہ وہ کرے ہم کو منظور۔ چنانچہ قاضی کے پاس گئے۔ اور کل حال بے کم و کاست اس کے روبرو بیان کیا۔ تو قاضی نے جب شیخ کی تقریر سنی۔ تو بہت دیر تک مراقبہ میں رہا۔ پھر کہا اے شیخ تو نے دولتمندوں کی از حد تعریف کی ہے اور درویشوں پر ظلم روا کیا ہے۔ تجھے یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں گل ہے وہاں خار بھی ہے۔ جہاں شراب ہے اس کے ساتھ نشہ اور خمار بھی ہے۔ جہاں خزانہ ہے وہاں مار زہردار بھی ہے۔ جہاں دُر شاہوار ہے۔ وہاں نہنگ مردم خوار بھی ہے۔ تمام دولتمند یکساں نہیں ہوتے۔ جس کے پاس دولت ہو یہ ضرور نہیں کہ وہ [illegible] اور بافیض بھی ہو ؎

اگر ژالہ ہر قطرہ دُر شدے
چو خر مہرہ بازار ازو پُر شدے

انسان وہ اچھا ہے جو درویش ہو مگر وہ تونگروں کی سی ہمت رکھتا ہو۔ اور
درویش کی خصلت رکھتا ہو۔ امیروں میں وہ بہتر ہے۔ جسے فقیروں کی فکر
ہے اور فقیروں میں وہ بہتر ہے جو دولتمندوں سے کم لے
یعنی جو شخص خدا پر توکل کرے اس کے لئے کافی ہے اس کے بعد قاضی نے
درویش کی طرف غصہ کی نگاہ کی اور کہا کہ تو نے بھی از حد مبالغہ کیا ہے۔ بیشک
بعض بعض اہل دول ایسے ہیں کہ ان کو کسی کی پرواہ نہیں ہے اور وہ اپنے
عیش و عشرت میں دن رات مست و مدہوش رہتے ہیں مگر ایسے ایسے بھی
لوگ ہیں جن کے فیض سے ایک عالم پرورش پاتا ہے۔ اور جنکی طفیل میں
لاکھوں کا کام نکلتا ہے۔ غرض قاضی نے دونوں کو قرار واقعی زجر و تنبیہ کی اور
اس امر پر مجبور کیا کہ صلح کرلیں۔ شیخ وہ ہے جس کا دل ہمیشہ مثل آئینہ کے زنگ
کینہ سے صاف تھا۔ فوراً درگذر کی اور یہ اشعار پڑھ کر اپنے مدعی سے
مصافحت کرلی اور دونوں بغلگیر ہوگئے ؎

مکن زگردش گیتی شکایت اے درویش
کہ تیرہ بختی اگر ہم بریں نسق مردی
توانگرا چو دل و دست کامرانت ہست
بخور ببخش کہ دنیا و آخرت بردی

پس ظاہر ہوا کہ یہ مجمع محاسن و کمالات دولتمندوں یا تونگروں سے میل
جول صرف اس غرض سے رکھتا تھا کہ ابنائے جنس کو فائدہ پہونچے اور ان کو
ہرگز ان سے کسی قسم کی ذاتی طمع نہ تھی۔ چنانچہ گلستان کی اور بھی چند حکایات
سے امیروں کے پاس شیخ کا اہل غرض کی سفارش لیجانا ثابت ہے ؎

سعدی کے علم و فضل کی نسبت اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ جامع علوم تھا چند
مفضل نے لکھا ہے کہ اس کو چھبیس زبانیں آتی تھیں۔ سعدی جہاں جہاں
گیا وہاں وہاں کی زبان اس نے سیکھ لی اور سیکھیں ایسی تھا جیسے پہلی کا ...

سعدی کی زبان عربی کے برابر کر لیا علم تفسیر فقہ و حدیث میں وہ کمال فنی مہارت رکھتے تھے
بعض مضمون اُسکے ایشیائی ہومر کہتے ہیں اور حکمت میں بڑے شاعر سمجھتے
ہیں۔ شیخ کی تصنیفات سے ظاہر ہے کہ وہ بہت بڑا فلسفی اور سائنس داں تھا
چنانچہ ایک بہت بڑے مضمون کو اُس نے دو شعروں میں عجیب خوبی کیساتھ
ادا کیا ہے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار
شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

تیسرا باب

شیخ کی سیاحت

شیخ مرحوم نے بہت سا حصہ اپنی عمر کا سیاحی میں صرف کیا اور مشرقی سیاحوں
میں ابن بطوطہ مسعودی اور ابن حوقل کے سوا شیخ سعدی سے بڑھ کر کوئی سیاح
نہیں گذرا۔ شیخ مرحوم مشرق میں خراسان ترکستان اور تاتار تک گیا ہے
اور بلخ و کاشغر وغیرہ میں قیام پذیر رہا ہے۔ جنوب میں سومنات تک آیا اور
سومنات سے ہندوستان کی سیر کرتا ہوا سمندر کی راہ سے عرب کو چلا گیا۔
تمام مغرب میں عراق عجم۔ بیابان۔ عراق عرب۔ شام۔ فلسطین اور ایشیائے کوچک
میں بار بار آیا اور گیا۔ اصفہان۔ تبریز۔ بصرہ۔ کوفہ۔ بیت المقدس۔ طرابلس الشرق۔
دمشق۔ دیار بکر اور اقصائے روم کے شہروں میں مدتہا سال اسکی آمد و رفت
رہی۔ مغرب کی جانب عرب اور افریقہ میں اسکا بار بار جانا اسکی تحریر سے معلوم ہوتا

ہندوستان سے واپس ہوتے ہوئے شیخ نے بغداد چھوڑا۔ آتشکدہ دیکھا اور حبش
میں ابراہیم بنا کی شیخ کی تصانیف سے ثابت ہوتا ہے سر گور اوسلی پیغمبر کی
شیخ نے ایشیا کوچک۔ بربر۔ حبش۔ مصر۔ شام۔ فلسطین۔ آرمینیا۔ عرب۔ بلاد کا اکثر
ایران اکثر ممالک۔ توران۔ ہندوستان۔ سمرقند۔ بابل۔ دیلم۔ کاشغر اور جیحوں سے
آگے تک اور بصرہ اور بغداد سے سرحد چین تک کی سیر کی اور چار دفعہ بیت اللہ
ایران انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا میں لکھا ہے کہ شیخ مرحوم مدینہ سے ۱۱۴۳ھ میں ہجرت
کر کے ۱۱۴۲ھ یا ۱۱۴۴ھ میں ہندوستان کی طرف روانہ ہوا اور
بحر قلزم۔ پنجاب اور گجرات ہوتا ہوا سومنات چلا گیا۔ سومنات میں چند
روز مقیم رہ کر دلی آیا۔ وہاں سے یمن پہنچا۔ یمن سے حبش، افریقہ اور بیکسیا
وہاں سے شام کی طرف متوجہ ہوا اور بہت مدت تک حبش میں رہا۔ یا دمشق سے
آزردہ خاطر ہو کر وہ جنگل یروشلم میں تارک الدنیا ہو بیٹھا۔

چیمبرز انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ شیخ مرحوم یورپ کے بھی اکثر ملکوں
میں پھرا ہے۔ اور یہ بات بیشک درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ اسکو لاطینی
اور فرانسیسی زبان میں بھی مہارت تھی۔

شیخ مرحوم نے دریا میں بارہا سفر کیا ہے۔ خلیج فارس۔ بحر عمان۔ بحر ہند
بحر عرب۔ بحر قلزم اور بحیرۂ روم میں اسکے متعدد سفر ثابت ہوتے ہیں۔ وہ
نفحات الانس میں لکھا ہے کہ شیخ نے بہت مدت تک بیت المقدس اور شام
کے شہروں میں اقامت کی ہے۔

شیخ آذری نے اپنی کتاب جواہر الاسرار میں بیان کیا ہے کہ شیخ آخری بار
ہندوستان آخری مرتبہ امیر خسرو کے دیکھنے کو آیا تھا لیکن یہ ارشاد غلط ہے
اس وقت ہندوستان اور ایران میں خسرو کی شہرت ہو چکی۔ اس وقت شیخ کا
عالم شباب تھا اور یہ یقین نہیں کہ اس عمر میں اس قدر دور دراز سفر محض
خسرو کو دیکھنے کی خاطر اختیار کیا ہو۔

بعض تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ شیخ نے چودہ حج پاپیادہ کیے تھے اور شیخ کے لئے کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ بلا کا جفاکش تھا اور اسکی تصنیفات سے بھی اس روایت کی تصدیق ہوتی ہے۔

شیخ کا سب سے پہلا سفر مکہ معظمہ کی جانب تھا اُس وقت شیخ کی عمر نو سال کی تھی۔ جب قافلہ حج کو جانے لگا۔ تو حاجیوں کا شیخ عبداللہ سعدی مقرر ہوا اس نے اپنے نو سالہ بچے کو چوروں اور رہزنوں کے ڈر سے ہمراہ لیجانا نامناسب سمجھا۔ مگر سعدی نے اپنی بھولی بھالی باتوں سے اپنی اماں کو سفر کرنے پر آمادہ کر لیا اور بخیریت تمام زیارت حرمین شریفین سے فارغ ہو کر واپس آیا۔

عالم سفر میں شیخ نے طرح طرح کی صعوبتیں اُٹھائی ہیں اور عالم غربت میں بڑی سخت تنگی اور عسرت نصیب ہوئی ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بیابان فید میں جو ایک وحشت خیز بے آب و علف جنگل اور چھ سو میل لمبا اور چار سو میل چوڑا صحرا ہے ان دنوں جب پیادہ سے شیخ کے پاؤں میں چلتے چلتے چھالے پڑ گئے تھے اور کچھ رات کی بیخوابی اور تکان سے اس قدر غلبہ ہوا کہ شیخ سر راہ پڑ کر سو گیا اتفاقاً اُدھر سے ایک شتر سوار گذرا اُس نے اونٹ کی نکیل کی رسی شیخ کے سر پر ماری اور کہا کیا جینے سے بیزار ہے کہ آواز جرس سے بھی بیدار نہیں ہوتا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ چند درویشوں کا وزیر سلطنت کی طرف سے کچھ وظیفہ مقرر ہوا مگر اتفاقاً ان میں سے ایک نے کوئی ایسی حرکت کی جو خلاف شان درویشان تھی۔ جس سے وزیر بدظن ہو گیا اور وظیفہ بند کر دیا۔ سب نے شیخ سے التجا کہ تمہاری مدد درکار ہے۔ ورنہ ایسی زندگی سے عار ہے۔ شیخ نے اُن کی درخواست کو منظور کیا اور وزیر کی ملاقات کو گئے۔ دربانوں نے ان کے پیچھے پلے لگا دیے کیونکہ [illegible] چنانچہ خود شیخ فرماتے ہیں ؎

در میر و وزیر و سلطان را — بے وسیلت مگرد پیرامن

سگ و دربان چو یافتند غریب — این گریبان گرفت و آن دامن

ہم ساتھیوں کو اُنکی درشتی صحبت اور خاطر و مدارات کی رعایت کو بھی یک قلم
میں سوتے۔ علی الصبح ہمارے ساتھ سے ہمارا ایک اسباب چرا اُٹھالیا اور جماعت
کے جاتے ہمارے پاس سے جا کر ایک مکان میں سیندھ لگائی اور ایک ڈبا زیور
کا چرایا اور پکڑا گیا۔ کوتوال اُسے ہمارے ہمراہ دیکھا تھا۔ ہم سب لوگ ناکردہ
گناہ پکڑے گئے اور قید ہوئے اُس دن سے ہم نے توبہ کی ہے کہ کسی ناواقف
شخص کو ساتھ نہ لینگے۔ شیخ نے کہا خیر اگرچہ آپ نے مجھے اپنی رفاقت کی عزت
نہیں بخشی مگر یہ نصیحت بھی جو آپ سے مجھے اس وقت حاصل ہوئی میرے
لئے بیش بہا جواہر سے کم نہیں ؎

ایک دفعہ مکہ کے بیابان میں شیخ مرحوم کئی دن کا جاگا ہوا تھا۔ خواب
نے ایسا غلبہ کیا کہ ناچار وہیں زمین پر لیٹ گیا اور شتربان سے کہا کہ بھائی تو
جا اور مجھے خدا کے حوالہ کر ؎

پائے مسکیں پیادہ چند رود
کز تحمل ستوہ شد بختی

ساربان نے کہا میاں ہوش کی دوا کرو۔ یہاں قزاقوں کا خوف ہے
اگر سو جاؤ گے تو اپنے ہاتھ سے پاؤں پر کلہاڑی مارو گے ؎

خوش است زیر مغیلاں براہ بادیہ خفت
شب رحیل ولے ترک جاں بباید گفت

شیخ علیہ الرحمۃ نے گلستان میں لکھا ہے کہ کوفہ کے میدان میں ہمیں ایک
شخص سر و پا برہنہ قافلہ حجاز کے ساتھ پیادہ جاتا ہوا ملا۔ یہ شخص اپنے حال
میں مست تھا اور کہتا تھا نہ تو میں اونٹ پر سوار ہوں اور نہ بار شتر کے نیچے
ہوں نہ میں صاحب رعیت ہوں نہ غلام شہریار ہوں۔ شتر سوار نے کہا
اے دیوانہ تو کہاں جاتا ہے مفت میں جان گنوائیگا۔ پیادہ نے ایک
نہ سنی اور سلامت ساتھ چلا آیا۔ ایک منزل پر ہم نے قیام کیا وہاں شانِ خداوندی

شتر سوار کی موت آگئی۔ دوم شیخ وہ پیادہ اس کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں تو نہ مرا لیکن حضرت اونٹ پر بھی نہ بچ سکے ؎

اے بسا اسپ تیزرو کہ بماند
کہ خر لنگ جاں بمنزل برد

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علیہ الرحمۃ کی سیاحت اس کے لئے ایک وسیع تجربہ و مشاہدہ کا ذریعہ تھی۔ وہ ذرہ ذرہ پر نظر رکھتا تھا۔ قطرہ قطرہ کی حقیقت اور ماہیت کی نسبت چھان بین کیا کرتا تھا اور اپنی معلومات کو ثابت کرتا تھا۔ ہر واقعہ اور ہر حادثہ سے وہ کوئی نہ کوئی نتیجہ نکالتا یا سبق حاصل کرتا تھا اور مکروہات زمانہ کو ذاتی تجربہ کے باعث ایسے پیرایہ میں بیان کرتا تھا کہ سامعین کو اس سے عبرت اور نصیحت حاصل ہوتی تھی ؂

شیخ کے وقائع سفر سومنات کا واقعہ نہایت عجیب ہے۔ جزیرہ نما گجرات میں سومنات ایک قدیمی مندر تھا جب وہاں پہنچا تو دیکھا کہ مندر کیا ہے ایک نگارخانہ چین ہے۔ جس میں ایک ہاتھی دانت کا بت دھرا ہوا ہے جسکی پرستش کے لئے لاکھوں آدمی دور دور سے آتے ہیں۔ مرادیں مانگتے ہیں اور لاکھوں روپے کا چڑھاوا چڑھاتے ہیں۔ شیخ کو تعجب ہوا کہ انسان اشرف المخلوقات ہے ان لوگوں کو کیا خبط ہوا ہے کہ ایک بیجان چیز کی پرستش کرتے ہیں اس بات کی تحقیقات کے لئے شیخ مرحوم نے ایک برہمن سے دوستی پیدا کی اور اپنی خوش لسانی کے باعث جلد اسکے ساتھ شیر و شکر ہو گیا۔ یہاں تک کہ دونوں اکٹھے ہی رہنے سہنے لگے۔ ایک دن اپنے دوست کو نہایت خوش دیکھکر شیخ نے دریافت کیا کہ یار تمہارے ملک کی بھی عجیب لایعنی رسم ہے کہ ایک بے حس مورت کے آگے سجدہ کرتے ہیں۔ غرض شیخ نے اس مورت کی حقارت اور شناعت کے لئے کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔ یہ گفتگو سنکر وہ برہمن چونکا ہوا اور کہنے لگا۔ اب معلوم ہوا کہ تو بھی مسلمان ہے۔ خیر ابھی کیا ہے

سومنات کے اس واقعہ کی نسبت بعض یہ اعتراض کرتے ہیں کہ شیخ نے پیغمبر
خدا کا خطاب اور اس سے مراد صرف بت پرستی کی مذمت ہے اور درحقیقت ایسے
بت مندر میں جو تمام ہندوستان کے مہاراجوں، راجاؤں اور اوتاروں کا سب
تھا جس میں ہر وقت لاکھوں پوجاری اور ہزاروں برہمن گانے والے اور سینکڑوں
جاری شب و روز موجود رہتے تھے شیخ مرحوم سے ایسے فعل کا ارتکاب ہونا عقلی امکان تھا
میں کہتا ہوں اس روایت میں کوئی بات خرق العادت یا حد سے باہر نہیں ہے
شیخ نے تمام پوجاریوں سے وہاں اپنا رنگ ایسا جمایا کہ تمام پوجاری اُسے برہمن
ہی سمجھنے لگے پس کیا عجب ہے کہ یہ فعل اُس نے ایسے موقع پر کیا ہو جبکہ مندر
میں کسی اتفاق سے کوئی موجود نہ تھا اور چاروں طرف سے مطلع صاف تھا۔

شیخ مرحوم نے یہ واقعہ نظم میں بیان کیا ہے اسکو پابندی نظم مدنظر تھی اسلیے
حسن بیان اور زینت الفاظ کا خیال تھا پس اگر وہ قصہ کی تمام جزئیات کے
بیان کرنے میں قاصر رہا تو اس میں کوئی اچنبا نہیں۔

شام یا عراق کے کسی شہر میں ایک زاہد مرتاض رہتا تھا جسکے معتقد بڑے
بڑے اشخاص تھے اور دُور دُور سے اُسکی زیارت کو آتے تھے۔ شیخ نے بھی
چند روز اُس کی خدمت کی اور ایک دن اُس سے درخواست کی کہ قبلہ کوئی
ایسی شئے عنایت ہو کر جس سے عشق مجسم ہو جائے اُس نے کہا کہ تمہیں عشق
حقیقی ہونا چاہئے اور عشق حقیقی کا پہلا زینہ عشق مجازی ہے جاؤ کسی پر عاشق ہو
شیخ اُس سے رخصت ہو کر آیا اور ایک قصاب کی لڑکی پر عاشق ہوا شہر کے
قصابوں نے پنچایت کی کہ اس بات سے شہر میں کسطرح عہدہ برا نہیں ہو سکتے
بہتر ہے کہ کسی تدبیر سے اسکو نکالا جائے چنانچہ تمام اکٹھے ہو کر شیخ کے پاس آئے
اور کہنے لگے کہ اے شخص تیری حرکت مذموم سے ہماری سخت بدنامی ہوتی ہے
ایک شرط پوری کرنی ہو تو ہم اس لڑکی کا نکاح تیرے ساتھ کرا دینگے۔ شیخ نے اقرار
کیا شرط یہ ہے لوگوں سے جو ... ہمارے کہ ہم ابھی ہی قوم اور کنبہ میں

لکنا ہاں پر رہتے ہیں۔ تو غیر قوم کے شہر سے مسافر ہے تب لڑکی کا نکاح کر دیگا
[illegible] نکاح کر [illegible] میر بیگ اور ہم کہیں سے ہم کو [illegible] اگر کل کو لڑکی ہم کو
سونپ جائے تو ہم کہیں کو [illegible] کہ ہم نے جو غیر قوم کے شخص کو لڑکی بیاہی تھی تو بعد چند
بیاہی تھی۔ بس اب شہر چھوڑ جائیے اور جو شرط پیش لکھی ہے اسکو پورا کر کے
آنے۔ اگر نالائقی آنے کر گے تو پچھتاؤ گے۔ غرض شیخ وہاں سے رخصت ہوا۔
اتفاق سے اسکا گزر کسی شہر کی مجلس میں ہوا۔ اس وقت شیخ نہایت
خستہ حال تھا۔ اسکے کپڑے پھٹے پرانے اور میلے کچیلے تھے اور مجلس میں تمام
علما و فقہا کمال شان و احتشام سے لباس فاخرہ پہنے ہوئے بیٹھے تھے۔ شیخ ان کی
سے برابر جا بیٹھا۔ [illegible] نے جھڑک کر اٹھا دیا اور قاضی نے بھی خشم آلودہ
نگاہ سے شیخ کی طرف دیکھا اور کہا "آیا [illegible] خود [illegible]" غرض شیخ کو [illegible] سے
پائیں مجلس میں جگہ ملی۔ اتفاقاً اس وقت کسی مشکل مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی اور
تمام لوگ اس عقدہ کے حل کرنے سے عاجز تھے۔ شیخ نے [illegible] سے با آواز بلند
کہا کہ اگر مجھے اجازت ہو تو میں بھی کچھ عرض کروں۔ سب شیخ کی طرف متوجہ
ہوئے اور اسکی کم حیثیتی اور جرأت پر سب کو حیرت ہوئی۔ شیخ نے فصیح تقریر میں اپنے
قوی اور دلائل ساطع دیکر اس عقدہ لاینحل کو ایک دو منٹ میں حل کر دیا۔ ہر
طرف سے تحسین و آفرین کی صدائیں آنے لگیں۔ قاضی نے مسند چھوڑ دی اور
عمامہ سر سے اتار کر شیخ کے آگے رکھ دیا۔ شیخ نے کہا یہ [illegible] کا [illegible] ہے مجھے نہیں
چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں یہ دستار سر پر رکھ کر تمہاری طرح پھٹے پرانے کپڑے
والوں سے نفرت کرنے لگوں۔ غرض شیخ اس قسم کی گفتگو کر کے وہاں سے چلا گیا۔

کہتے ہیں دمشق شہر کے بادشاہ نے بہت سی شراب پی کہ حالت بدمستی میں اپنی
بیگم سے قسم کھائی کہ میں تمام بادشاہی تجھے بخش دونگا اگر نہ بخشونگا تو تیری
طرف سے مجھکو طلاق ہوئی۔ جب بادشاہ کا نشہ ہرن ہوا تو اپنے اقرار کو یاد کر کے
پچھتایا اور تمام علماء اور وزرا کو جمع کر کے کہنے لگا کہ کوئی ایسی تدبیر کرو

ایا اور بہت [illegible] اپنے دوستوں کی صحبت [illegible]
دو علوم خود حلب اور [illegible] دمشق سے برداشتہ خاطر ہو کر
بیابان قدس یعنی فلسطین کے جنگلوں میں رہنا اختیار کیا اور حیوانوں سے
انس پیدا کیا ان دنوں فلسطین یعنی بیت المقدس میں صلیبی لڑائیوں کا سلسلہ جاری
تھا اور عیسائی اہل اسلام کے خون کے پیاسے تھے اتفاقاً شیخ علیہ الرحمۃ عیسائیوں
کے ہاتھ آگئے انہوں نے فوراً اس کو قید کر لیا اور شرقی تریپولی کی خندق پر
جو شہر کے استحکام و حفاظت کے لئے تیار ہو رہی تھی یہودی اسیروں کے
ساتھ جو لڑکپن اور کمسنی سے قید فرنگ میں گرفتار ہو کر آئے تھے اسکو گارے
و چونے پر لگا دیا سر پر اینٹوں کی ٹوکری بدن پر پھٹے ہوئے کپڑے اور پھاوڑا
[illegible] ہاتھ پکڑ کر ایک حلبی امیر کے آئینہ دل پر جو اتفاق وہاں آنکلا تھا عکس
پڑا اور شیخ سے دریافت کیا کہ کس حال میں ہو۔ شیخ نے جواب میں یہ اشعار
پڑھے ع

ہمے گریختم از مردمان بکوہ و بدشت — کہ از خدائے نبودم بدیگرے پرداخت
قیاس کن کہ چہ حالم بود دریں ساعت — کہ در طویلہ نامردماں بباید ساخت

پھر کہا کہ جو شخص لوگوں سے کوسوں بھاگتا تھا وہ آج بیگانوں کے پنجہ میں
گرفتار ہے زندگی سے بیزار ہے امیر حلب کو ترس آیا اور دس دینار دے کر
شیخ کو اس قید سے رہائی دلوائی اور اپنے ہمراہ حلب لیگیا اس امیر کی ایک بیٹی
ناکتخدا تھی اس نے شیخ کا نکاح سو دینار مہر مقرر کر کے اپنی لڑکی سے پڑھا دیا
شیخ کچھ مدت تک حلب میں رہا مگر شیخ کی بیوی پرلے درجہ کی بدمزاج اور بد
زبان تھی اسکی زبان درازی سے شیخ کا دم ناک میں آگیا تھا ایک دفعہ کسی
نوبت پر لڑکی کہنے لگی کہ بس بیٹھو بھی بہت بڑھ بڑھ کے باتیں [illegible] مجھکو
تمہاری حقیقت معلوم ہے آپ وہی ہیں جسے میرے باپ نے دس دینار دیکر خریدا
تھا شیخ نے جواب دیا ہاں وہی بندہ وہی غلام ہے جسکو حضور کے والد نے دس دینار کو

سیہ اور سو دینا کو حضور سے ہی الاماں

اس عورت کی نسبت ایک اور روایت بھی مشہور ہے کہ ایک روز شیخ سعدی شادی کے برخلاف وعظ کر رہے تھے۔ ایک شخص نے کہا میں باحسن تدبیر تبلیغ کرتے ہو۔ دوسرے روز آپ نے فرمایا کہ آج ہمارے ہاں آپ کی دعوت ہے۔ جس وقت مہمان کھانا کھانے آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ بلائے ناگہانی شیخ بزرگ کے سر پر سوار ہے۔ شیخ نے کہا کہ بیوی غصہ کو تھوک دو اور ایک مہمان آیا ہے اس کے لئے کچھ کھانے کا بندوبست کرو۔ بس خدا کی چاہی نے ایک مٹی کی ہنڈیا اٹھا کر اس زور سے سعدی کے سر پر رسید کی کہ گھیرا حمائل ہو گیا۔ اسی حالت میں آپ باہر نکلے۔ مہمان نے پوچھا حضرت! یہ گلے میں کیا ہے۔ جواب دیا کہ بھائی صاحب ؎

نگویم سنت پیغمبر است!

ایک دفعہ شیخ سعدی کاشغر کی جامع مسجد میں وضو کر رہا تھا۔ اتفاقاً وہاں ایک طالب علم مقدمہ زمخشری ہاتھ میں لئے پڑھ رہا تھا ضرب زید عمرواً۔ شیخ نے کہا کہ خوارزم و خطا میں صلح ہو گئی مگر زید اور عمرو میں خصومت ہنوز باقی ہے۔ طالب علم نے ہنس کر شیخ کا وطن پوچھا۔ شیخ نے جواب دیا کہ خاک پاک شیراز۔ اس نے کہا سعدی کا کلام یاد ہو تو سناؤ۔ شیخ نے فی البدیہہ کہا ؎

اے دل عشاق بدام تو صید

ما بتو مشغول و تو با عمرو زید

دوسرے دن شیخ کاشغر سے چل دیا۔ اس طالب علم کو بعد میں کسی سے معلوم ہو گیا کہ شیخ سعدی یہی ہیں۔ طالب علم بھاگتا ہوا شیخ کے پاس آیا اور کہنے لگا ہے نصیب جو حضور کی زیارت ہوئی۔ حضور چند روز شہر میں چل کر قیام فرمائیں کہ ہمیں بھی خدمتگزاری سے مستفیض ہونے کی سعادت

ہے۔ یہاں بھی ایک قسم کی کمان ہے۔ کمان و گمان میں تجنیس لفظی ہے گمان و سنگ کو
نہ ہوں۔ بیشک سنگ میں تجنیس لفظی ہے۔ پس تو سنگ ہے" اس طرح مدت
تک اُسکی اور سعدی کی چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی۔ آخر شیخ نے اُس کو اپنی
قابلیت اور جادو بیانی کے زور سے معقول کر دیا اور جب اسکو معلوم ہوا کہ یہ
سعدی شیرازی ہے تو اُس نے شیخ کے قدم لیے اور نہایت عجز و انکسار کے ساتھ
اپنی بیہودگی کی معافی مانگی۔ یہ اور اس قسم کے کئی قصے زبانزد عام ہیں جن پر اعتبار
بمشکل ہو سکتا ہے ۔

ایک دفعہ دیار بکر میں شیخ علیہ الرحمۃ کا گذر ہوا اور شیخ نے ایک دولت مند
شخص کے مکان پر قیام کیا۔ رات کو جب کھانے سے فارغ ہوئے تو میزبان نے
کہا کہ دنیا میں مجھے سب سے عزیز ایک بیٹا ہے اس سے زیادہ کسی شے کو میں
عزیز نہیں سمجھتا ہوں تو مجھے سب کچھ دے رکھا ہے گویا کہ زندگی کے باغ کا
پھل ہے۔ مجھے ترس ترس کر ملا ہے اس شہر میں ایک درخت ہے جو لوگوں
کا زیارت گاہ ہے اور لوگ دور دور سے وہاں مرادیں مانگنے آتے ہیں میرا بچہ
میں نے کئی راتیں اس درخت کے تلے جاگا اور خدا سے تضرع اور زاری
کے ساتھ ... مانگتا رہا ہوں۔ اب اخیر عمر میں خدا نے میری سنی ہے اور
یہ بچہ میرے اندھیرے گھر کا اجالا بنا دیا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد شیخ کو
کسی ضرورت سے میزبان کے پاس سے اُٹھکر دوسرے کمرہ میں جانے کا اتفاق
ہوا۔ سنا کہ وہ لڑکا جس پر باپ جان دیتا تھا اپنے یار آشناؤں میں بیٹھا
کہہ رہا تھا کہ یارو دعا مانگو کہ یہ بڈھا خرف جلد ہلاک ہو جائے تاکہ گنج بے قیاس ہاتھ
آوے اور پھر ہم خوب گلچھرے اڑائیں۔ چلو اُس درخت کے تلے چل کر دعا مانگیں
کہ پیر فرتوت جلد ہی لڑھک جاوے ۔
جب شیخ نے یہ گفتگو سنی تو اُس کے دل پر سخت صدمہ ہوا اور دنیا کی بیوفائی
کا نقشہ اسکی آنکھوں کے سامنے ہو گیا۔ سچ ہے دنیا مطلب کی ہے ۔

چاہئے قزاقوں کی آمد کی علامات نظر آتی ہیں۔ جوان سے مخاطب ہوا اور
یہ مقام وہیں میرے خوف سے شیرنیاں پستان بچہ چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ اور جنگل
کے مار خود بخود رام ہوتے ہیں۔ قزاقوں کی کیا مجال ہے کہ میرے سامنے
آئیں۔ خود ہی ہوئے اور ان کے قتل کا ارادہ کیا۔ شیخ نے کہا اے پہلوان کیا
دیکھتا ہے دو ایک دشمن آ پہنچے۔ اگر مرد میدان ہے تو کچھ جوہر دکھا۔
قزاقوں کے دیکھتے ہی اس پہلوان ہاتھ پاؤں میں رعشہ پڑ گیا تیر و کمان ہاتھ
سے گر گئے اور چہرہ کا رنگ زرد ہو گیا۔ سب سے پہلے شیخ نے اپنے بدن کے کپڑے
اتار کر چوروں کی نذر کئے۔ شیخ کی دیکھا دیکھی سب نے اپنا مال و متاع خون جگر
بیکر ڈاکوؤں کے حوالہ کیا اور جان بچائی ؁

شیخ کی سیاحت میں دریائے عمان کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ ایک دفعہ شیخ
علیہ الرحمۃ کا گذر عمان کی ولایت ہوا اس وقت شیخ عسرت اور تنگی کے
ہاتھوں سخت مجبور تھا کپڑوں کی دھجیاں اڑی ہوئی تھیں پیراہن میں
ہزاروں پیوند لگے ہوئے تھے۔ ملازمان شاہی نے اس کو اجنبی صورت
دیکھ کر حمام کرایا اور عمدہ لباس فاخرہ پہنا کر حضور شاہ میں پیش کیا۔ بادشاہ
نے دریافت کیا کہ سنا ہے تم نے بہت دور دراز کا سفر کیا ہے۔ تمہاری نظر
میں میرے ملک کی حالت کیسی ہے۔ شیخ نے عرض کیا کہ قبلۂ عالم رعیت
جتنی آسودہ اور خوشحال اس دیار میں دیکھی کہیں نہیں دیکھی۔ جہاں کہیں
مجھے قیام کرنے کا اتفاق ہوا میں نے خرابات خراب اور مسجدیں آباد دیکھیں
اور ہر جگہ میری خاطر خواہ مہمان نوازی ہوئی۔ غرض شیخ مرحوم نے ایسی چرب
تقریر کی کہ بادشاہ دل و جان سے شیخ کی حسن گفتار کا شیدا ہو گیا۔ مختصر
شیخ نے بادشاہ کے مزاج میں ایسا دخل پایا کہ خلوت و جلوت میں موجود رہنے
لگا بادشاہ نے شیخ کو ہر پہلو سے آزمایا اور اس شخص کے کھرے میں کسی طرح کا
کھوٹ نہ پایا۔ ایک دن دربار عام کر کے شیخ کو خلعت وزارت بخشا اور اپنا دوست خاص

کیا جرات ... کی کاروبار کے سیاہ و سفید کا مالک بنایا وزیر سابق کو اس بات
سے سخت رشک و حسد ہوا اور وہ اسباب کے درپے ہوا کہ اس کسی طرح سے
کوئی نہ کوئی عیب لگا کر نگاہ شاہی سے گرائے مگر شیخ زیادہ دیندار اور نیک
بخت تھا اس نے کبھی کوئی امر ایسا نہ کیا جس سے اس کا گرفت ہو۔ قضا را
اسی بادشاہ کے در پر چند غلام آسمان حسن و جمال کے آفتاب تھے جناب شیخ جو
ہمیشہ سے حسن پرست تھا ان کو بہت عزیز رکھتا تھا اور اکثر ان کی جانب دھیان
رکھتا تھا اس کے دشمن جو ہر وقت تاک میں لگے رہتے تھے اس بات کے
سر ہو گئے اور بہت کچھ آوازے کسنے کا بہانہ بنا کر مشہور کر دیا جب بادشاہ کو خبر لگی تو
اُسے سخت غصہ آیا مگر وہ آدمی بڑا دانا تھا اس نے دل میں سوچا کہ اکثر
دشمنوں کی افترا پردازی معلوم ہوتی ہے جب تک میں اپنی آنکھوں سے
نہ دیکھ لوں تب تک اعتبار نہ کرنا چاہیے۔ غرض اس دن سے بادشاہ ان
دونوں کی حرکات اور سکنات پر خفیہ نظر رکھنے لگا۔ اتفاقاً ایک دن دربار
میں تمام شخص حاضر تھے ناگاہ شیخ نے نظر اٹھا کر ایک غلام کی طرف دیکھا
غلام بھی زیر لب مسکرایا اس سے بادشاہ کو یقین ہو گیا کہ ضرور کچھ دال میں کالا
کالا ہے یہ بادشاہ نہایت رحم دل تھا باوجودیکہ اپنی آنکھوں سے اس نے شیخ کی
اشارہ بازی دیکھی تھی مگر ضبط کیا اور نہایت آہستگی کے ساتھ شیخ سے کہا کہ میں تم کو
بڑا دانا سمجھتا تھا مجھے یہ امید تھی کہ دیانتداری سے ہر ایک کام کو انجام دے گا
افسوس مجھے یہ خبر نہ تھی کہ ظاہر باطن تیرا یکساں نہیں ہے۔ ظاہر میں تو سونا ہے
اور باطن میں پیتل ہے بد تر ظاہر میں تو پارسا اور پرہیزگار ہے اور باطن میں
شوخ چشم اور بدکار ہے۔ آج مجھے تحقیق ہو گیا کہ تو اس بندے کے لائق نہیں
ہے۔ مگر خدا سمجھے تیرا قصور نہیں جو کچھ خطا ہے وہ میری ہے تجھ میں بدگمانی پرورش
کرتا رہا تیرا فعل ان سے بالا تر تھا۔ جب سعدی نے بادشاہ کو بہت برہم دیکھا تو
ادب سے عرض کی کہ حضور کو کسی میرے دشمن نے بدظن کر دیا ہے۔ در اصل

اتابک ازبک پہلوان اور سلطان غیاث الدین کے عہدوں میں اور تمام بستیاں
ویران ہو گئی تھیں اُسکے عہد میں آباد ہو گئیں اس نے شیراز کے مدارس اور مساجد
کے نئے گاؤں اور جاگیریں وقف کیں۔ شفاخانے بنوائے اور حاذق طبیب
ان پر مقرر و مامور کئے۔ اس امر کی تائید شیخ کے کلام سے بھی ہوتی ہے چنانچہ
ایک وہ قطعہ جو اس نے مراجعت کے وقت کہا مفصلہ ذیل ہے ؎

ندانی کہ من در اقالیم غربت — چرا روزگارے بکردم درنگی
برون رفتم از تنگ ترکاں کہ دیدم — جہاں درہم افتادہ چوں موئے زنگی
ہمہ آدمی زادہ بودند لیکن — چو گرگاں بخونخوارگی تیز چنگی
درون مردمے چون ملک نیک محضر — برون لشکرے چون ہزبران جنگی
چو باز آمدم کشور آسودہ دیدم — پلنگاں رہا کردہ خوئے پلنگی
چناں بود در عہد اول کہ دیدم — جہاں پر ز آشوب و تشویش و تنگی
چنیں شد در ایام سلطان عادل — اتابک ابوبکر بن سعد زنگی

جب شیخ شیراز میں واپس آیا تو اُس نے دیکھا کہ اتابک ابوبکر میں یہ سخت
عیب ہے کہ وہ علماء اور فضلاء سے سخت بدگمان رہتا ہے اور جاہل فقیروں
اور خانہ بدوش درویشوں کی حد سے زیادہ قدر و منزلت کرتا ہے۔ چنانچہ
اسی بدگمانی کے باعث اُس نے امام صدر الدین محمود۔ امام شہاب الدین
تورہ پشتی۔ مولانا عز الدین وغیرہم کو طرح طرح کے عذاب اور زجر و تہدید سے جلا
وطن کر دیا تھا۔ قاضی عز الدین علوی جیسے سندی سید کا مال و املاک ضبط کر لیا تھا
اپنے والد بزرگوار کے وزیر اعظم عمید الدین اسعد کو مع اسکے فرزند تاج الدین محمد کے
قلعہ میں قید کر دیا تھا اور وہ بیچارہ قید خانہ میں مر چکا تھا۔ یہ حال دیکھ کر شیخ نے
مناسب سمجھا کہ ایسے بادشاہ کے زمانہ میں اس سے زیادہ مناظرین مصلحت
نہیں۔ چنانچہ عمداً یہی آفت زہد و گوشہ نشینی رائج کے اصول پر کاربند ہوا اور دربار
میں بہت ہی کم آیا جایا کرتا تھا۔

اسی ابوبکر کی نسبت تاریخ وصاف میں ایک عجیب روایت درج ہے۔
لکھتے ہیں کہ ایک شیریں خط و ایمان فضیلت مآب بن کر ابوبکر کے دربار میں آیا
اتابک نے نہایت تعظیم و تکریم کی اور نماز کے وقت اسے امام بنایا۔ شیریں ملا نے
قرأت کی غلطیاں کیں جس سے اتابک بہت خوش ہوا اور اسکو انعام
کرام سے مالا مال کر کے رخصت کیا۔ شیخ کی مراجعت وطن کے کچھ عرصہ بعد
خواجہ علاء الدین نے شیخ کو پچاس ہزار دینار دیئے اور اس امر پر مجبور کیا کہ وہ
ان کو قبول کر کے اپنی زندگی میں ہی اپنا مقبرہ بنا لے۔ شیخ نے ہر چند انکے لینے
سے انکار کیا مگر اس نے منت سماجت سے اسکو راضی کر لیا۔ چنانچہ شیخ نے اپنی
زندگی میں اُس رقم سے ایک عالیشان خانقاہ پہاڑ کے نیچے جو گوشہ شمال
و مغرب میں شہر سے لاحق ہے بنوائی اور آخر عمر تک وہیں عزلت نشین رہا۔
شیخ نے وطن میں آکر روابط دنیاوی کو بالکل ترک کر دیا اور اس خانقاہ
میں دن رات خیالات تصوف میں مستغرق رہنے لگا۔ جس قدر اسکا خیال
طالب علمی کے زمانہ میں تصوف کیطرف سے ہٹ گیا تھا اسی قدر آخر عمر میں
کامل ہو گیا۔ چنانچہ دور دور سے لوگ اور اہل علم حقائق و معارف کے دقائق اُس سے
پوچھنے آتے اور اس کے فیضان صحبت سے مستفیض ہوتے تھے۔

آخر اس صاحب کمال کا بھی پیمانہ عمر لبریز ہوا اور بقول پروفیسر اتھی صحیح
سنہ ۱۲۹۲ء میں جمعہ کے دن ۹ دسمبر مطابق شوال ۶۹۱ سنہ ہجری میں شیخ علیہ
الرحمۃ کا مرغ روح قفس عنصری سے عالم جاودانی کیطرف پرواز کر گیا۔ کسی
شاعر نے تاریخ وفات اسطرح لکھی ہے ؎

زرد بہ ساعت شیخ سعدی | کہ در دریائے معنی بود غواص
مہ شوال روز جمعہ او جشن | بدان درگاہ رفت از روئے اخلاص
یکے پرسید سال فوت گفتم | ز خاصان بود ازاں تاریخ شد خاص

[illegible] میں ولیم فرینکلن انگلستان کا ایک سیاح شیراز میں گیا تھا اُس نے

شیخ کی مزار کا نقشہ اپنے سفرنامہ میں بدین الفاظ کھینچا ہے۔

شیخ کا مزار مقام دلکشا سے ایک میل جانب مشرق پہاڑ کے نیچے واقع ہے عمارت اسکی بہت پرانی اور مربع ہے اور قبر سنگین بنی ہوئی ہے اسکا طول چھ فیٹ اور عرض ڈھائی فیٹ ہے۔ قبر کے تمام پہلوؤں پر کچھ عبارت در خط نسخ میں کندہ ہے جس میں شیخ کا اور اسکی تصنیفات کا حال درج ہے قبر ایک سیاہ رنگ کے چوبی قبرپوش سے جس پر سنہری کام ہو رہا ہے ڈھکی رہتی ہے اور اس پر شیخ مرحوم کے دو اشعار خط نستعلیق میں لکھے ہیں بعض کہتے ہیں کہ مفصلۂ ذیل اشعار ہیں ؎

(۱) اے کہ بر خاک ما گذری ‏ بخاک عزیزاں کہ یاد آوری

کہ گر خاک شد سعدی او را چہ غم ‏ کہ در زندگی خاک بود است ہم

جب اس قبرپوش کو ہٹاتے ہیں تو قبر کا تعویذ دکھائی دیتا ہے اکثر اہل اسلام دور اطراف و جوانب سے شیخ کی مزار پر آتے ہیں وہ پھول اور دیگر اقسام کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور زائرین کے مطالعہ کے لئے ایک نسخہ کلیات کا نہایت خوشخط لکھا ہوا مزار پر رکھا رہتا ہے مقبرہ کی دیواروں پر بہت فارسی اشعار لکھے ہوئے ہیں جو لوگ دور دست مقامات سے وہاں آتے ہیں یہ اشعار انھوں نے لکھے ہیں۔ شیخ کے مقبرہ کی عمارت اب روز بروز گرتی جاتی ہے اور اگر اب اسکی خبر جلد نہ لی گئی تو وہ بالکل کھنڈر ہو جاویگی نہایت افسوس کی بات ہے اور زمانہ کا عجب انقلاب ہے کہ کسی شخص کو اسکی مرمت کرانیکا خیال نہیں ہے اس مقبرہ کے متصل اکثر دینداروں اور بزرگوں کے مزار ہیں جنھوں نے اپنی خواہش سے یہاں دفن ہونا چاہا تھا

سر گور اوسلی صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۸۱۱ء کے شروع میں جبکہ جارج سوم بادشاہ انگلستان کی طرف سے میں بعہدہ سفارت فتح علی شاہ قاچار کے پاس پیغام لیکر طہران کو جاتا تھا اس وقت کئی مہینے شیراز میں میرا مقام رہا

چنانکہ میں بارہا اکثر شیخ کے مزار پر جاتا تھا مسٹر فرینس کے کہنے کی تصدیق شیخ کے مزار پر جا کر ہوتی ہے۔ اسکی قبر حقیقت میں بالکل بوسیدہ ہو گئی ہے اور تمام عمارت قریب منہدم ہوا چاہتی ہے۔ باغ اور درخت جو اس زمانہ میں وہاں تھے ان کا اب نام و نشان تک باقی نہیں ہے میرے دل میں خیال آیا کہ اگر تھوڑا سا روپیہ خرچ کیا جائے تو اس مقبرہ کی مرمت بخوبی ہو سکتی ہے اور میری حسن عقیدت نے جو کہ میں شیخ اور اس کے کلام کے ساتھ رکھتا تھا مجھ کو آمادہ کیا کہ اپنے پاس سے روپیہ خرچ کر کے شیخ کے مقبرہ کی مرمت کراؤں مگر شاہ ایران کا پانچواں بیٹا حسین علی مرزا جو اس وقت فارس کا گورنر تھا اس نے مجھ کو اس ارادہ سے باز رکھا اور نہایت سرگرمی سے کہا کہ میں اس مقبرہ کی مرمت کرا دونگا آپ کیوں اس قدر تکلیف اٹھاتے ہیں اس نے کہا کہ میں شیخ کے مزار کی مرمت اسی اسلوب و عمدگی سے کرا دونگا جیسی کہ کریم خاں زند نے خواجہ حافظ کے مزار کی کرائی تھی لیکن افسوس ہے کہ اس نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا۔

شیخ کا مذہب جیسا کہ اسکے کلام سے ثابت ہوتا ہے سنی تھا قاضی نوراللہ شوستری نے مجالس المومنین میں لکھا ہے کہ اس کا مذہب شیعہ تھا مگر ظاہر ہے اس کے سنت جماعت ہونے میں ذرہ بھر بھی کلام نہیں ہے مگر دولتشاہ نے یہاں تک لکھا ہے کہ شیخ مرحوم نے **شیخ عبدالقادر جیلانی** قدس سرہ سے بیعت کی تھی۔ یہ بات بھی صداقت سے خالی معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ شیخ سعدی کی ولادت سے پہلے حضرت عبدالقادر جیلانی ۵۶۱ھ میں وفات پا چکے تھے

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ شیعہ بے تبرا اور سنی بے تعصب تھا۔ مولوی علی لکھتے ہیں کہ ہم ایسے شخص کو جو مقبول فریقین تھا۔ ایک گروہ کا مقبول اور دوسرے گروہ کا مردود نہیں بنانا چاہتے بڑی بات یہ ہے کہ وہ بے تعصب تھا اور یہی اسکے ناجی ہونے کی دلیل ہے۔

شیخ مرحوم ایک سیدھا سادہ مسلمان تھا وہ دکھاوے اور ظاہرداری سے

وصول ہو گیا تھا۔ شیخ جانتا تھا کہ میں بشر ہوں اور اقتضائے بشریت سے خالی نہیں۔ اسکو بہتی تقدس نہ بن جانے کے لئے طرح طرح کے بہروپ بھرنے نہیں آتا۔ اس کا اصول یہ شعر تھا۔

کلید در دوزخ است آن نماز
که در روی مردم گذاری دراز

پانچواں باب

شیخ کی شہرت اور لوگوں کی عقیدت

ابھی شیخ مرحوم مدرسہ ہی میں تھا کہ اسکی فصاحت و بلاغت کا شہرہ کاشغر تک جو شیراز سے تخمیناً سولہ سو میل کے فاصلہ پر ہے پہنچ گیا۔ رفتہ رفتہ اسکی شہرت نے اسکی زندگی ہی میں تمام ایران۔ ترکستان۔ تاتار۔ ہندوستان وغیرہ کو مسخر کر لیا اور آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ اسکا کلام ایشیا۔ یورپ اور افریقہ میں ترجمہ ہو کر نہایت قدر اور منزلت کے ساتھ دیکھا گیا۔ جو عام قبولیت شیخ کے کلام نے حاصل کی ہے وہ ہماری رائے میں تمام دنیا میں کسی مصنف یا شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔

شیخ مرحوم کی اس غیر معمولی شہرت کا باعث یہ ہے کہ وہ ایک اونچا صاحب نظر تھا۔ اسکو نظم و نثر دونوں میں اس درجہ کی دسترس تھی کہ اسکی تحریر و تقریر دیکھنے اور سننے والوں کے دل پر اپنا تسلط جما لیتی تھی۔ وہ نظم و نثر دونوں کا بادشاہ تھا۔ اس کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بے نظیر ناظم تھا اور اسکی نثر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس جیسا نثار نہ کوئی ہوا ہے نہ ہوگا۔ تاریخ کا ذکر آئے تو ایک صاحب نظر مورخ تھا۔ تفسیر کا موقع آئے تو وہ ایک باخبر مفسر تھا

علم ادب کا بیان ہو تو وہ ایک فاضل ادیب تھا فلسفہ کا دھیان آوے تو وہ اچھا خاصہ فلسفی تھا۔ فقہا اور عباد کے مجمعوں میں حسن فصاحت کے ساتھ وہ عمل افشانی کرتا تھا جو اسی کا حصہ تھی۔ اور تصوف میں تو ایک وہ ماہر خاص تھا کہ وحدت وجود اور وحدت شہود میں علم اشراق کا پرتو دیکر کبھی ابوسعید ابوالخیر تھا اور کبھی محی الدین عربی ۔

شیخ میں ایک نرالی بات یہ تھی کہ صاحب قلم و زبان تھا جس قدر اسکی تحریر میں زور تھا اُس سے دس گنا اسکی تقریر میں شور تھا اس عذب البیان اور طلیق اللسانی سے وہ بحث و مناظرہ کی مجالس میں اپنا رنگ جما لیتا تھا کہ اسکی رائے سب پر غالب رہتی تھی ۔

شیخ کی جادو بیانی کا مختلف ممالک میں اس قدر چرچا ہے کہ اس کا کلام ضرب الامثال ہو گیا ہے۔ نصیحت کے وقت لوگ جس تڑاقے سے شیخ مرحوم کے اشعار پڑھتے ہیں اور کسی شاعر کے نہیں پڑھتے۔ خواہ کیسا ہی محل یا موقع ہو اس باکمال کے اشعار برمحل اور مناسب موقع اُس کی تصنیف کے ذخیرہ میں ملتے ہیں۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ جس کے باعث جمہور نے اسکی کلام کو زیادہ تر پسند کیا شیخ نے ایک زمانہ دیکھا اُس کو عوام الناس کی ضروریات روزانہ معاملات کا کافی حقہ علم تھا۔ اسلئے جو وہ کرتا تھا وہ حسب حال اور نہایت چبھتی ہوئی کہتا تھا جو بات حسب حال اور مناسب موقع معلوم ہو وہ بغیر بحث و حجت کے خود بخود دلوں پر نقش ہو جاتی ہے پس یہی وجہ ہے کہ شیخ علیہ الرحمۃ نے عالمگیر شہرت حاصل کی اور اسکا کلام اطراف عالم میں پھیل گیا ۔

شیخ علیہ الرحمۃ نے طبیعت انسانی کا خاص طور پر مطالعہ کیا تھا اس لئے وہ خاص طبیعت سے کما حقہ آگاہ تھا اور لوگ اس ملکہ کے باعث اسے ترجمان اسرار اور لسان الغیب کہتے تھے

شیخ کی مقبولیت کلام کی نسبت ایک روایت زبان زد خلائق ہے کہ ایک
بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دروازے یکایک کھل گئے اور فرشتے
نور کے طبق لیکر زمین پر نازل ہوئے۔ اس بزرگ نے حیران ہو کر دریافت
کیا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ فرشتوں نے جواب دیا کہ شیخ کا ایک بیت جناب الٰہی
میں مقبول ہوئی ہے اور یہ اس بیت کا صلہ ہے وہ بیت یہ ہے ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

اس عجیب ماجرا کے سنتے ہی وہ بزرگ خواب سے بیدار ہو گئے اور اسی
وقت شیخ مرحوم کے عزلت خانہ پر یہ مژدہ جانفزا سنانے گئے وہاں دیکھا
کہ شیخ علیہ الرحمۃ چراغ جلائے بیٹھے ہیں اور جھوم جھوم کر کہہ رہے ہیں ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

یہ حکایت نہایت مشہور ہے۔ چنانچہ اسی حکایت پر فیضی کے مخالفین نے
ایک دلچسپ مضمون تراشا ہے کہ شیخ فیضی نے سنا تھا کہ شیخ علیہ الرحمۃ کو
ایک شعر کے صلہ میں اولیا کا رتبہ مل گیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ آؤ ہم بھی ایک
برجستہ شعر کہہ کر ولی بن جاویں۔ چنانچہ قل رحمٰن کی تمہید لکھتے لکھتے یہ شعر
کہا ؎

دُر ہر بُن مو کرے نہی گوش
فوارہ فیض اوست در جوش

یہ شعر ان کو بہت پسند آیا اسکو بار بار جھوم جھوم کر پڑھتے تھے اور شیخ مرحوم
کی طرح صلہ کی توقع میں آسمان کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔ جب کوئی بار
آور کوئی فرشتہ نور کے طبق لیکر نہ آیا تو ایک مرتبہ بیقرار ہو کر آسمان
کی طرف منہ اٹھا کر یہ شعر بلند آواز سے پڑھا۔ اتفاقاً ایک چیل منڈیر

رسیدنی ہوئی تھی۔ فیضی نے آیا۔ دُس کر دشی اور ہنگام پر دانہ پنچال چھوڑی
جو فیضی کے منہ پر آکر پڑی۔ فیضی جھنجھلایا اور کہا بس معاف رکھئے شعر ی
عالم بالا معلوم شد ؛

یہ مضمون غالباً عبد القادر بدایونی کا تراشا ہوا ہے۔ اور اسپر لوگوں نے
اور حاشیہ یہ چڑھایا ہے کہ جب رومال سے فیضی منہ کو صاف کر رہے تھے۔ تو
بزم میں سے کسی نے یہ شعر پڑھ دیا ؎

جو کی تقلید خسرو کی تو کارکردہ کن بگڑا
چلا جب چال کو آ ہنس کی اسکا چلن بگڑا

اور جب عرفی شیرازی کو خبر ہوئی۔ تو اُس نے ہنس کر کہا آنچہ انسان میکند
بوزینہ ہم ؛

شیخ کی نسبت کسی بزرگ کا خواب دیکھنا کسی طرح عقل یا تجربہ کے خلاف نہیں
ہے۔ خواب کا ایک حد تک سچا ہونا اور ان میں معمولی باتوں کا غیر معمولی صورت
میں نظر آنا ایک ایسا مسلم امر ہے کہ آج کل کے فلسفی بھی اس سے انکار نہیں
کر سکتے شیخ کا شہرہ ان دنوں میں عروج عیوق پر تھا شیخ ہر طرف سے مرجع خلائق تھا
غرض اُنکا علم وفضل۔ انکی فقر و درویشی۔ شاعری۔ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی
ایک عالم میں مشہور تھی جس کے باعث اکثر بزرگوار اسکو نظر حسد و رشک
سے دیکھتے تھے اور اگر ایک بزرگ نے ایسی حالت میں جبکہ شیخ کی نسبت
حسن ظن اُس کے دل میں غالب تھا مذکورہ بالا واقعہ خواب میں دیکھ لیا ہو
تو ذرہ بھی تعجب نہیں ہے ؛

البتہ فیضی کی نسبت جو روایت بیان کی جاتی ہے۔ وہ سراسر ہیچ در ہیچ ہے
اور اُسکے دشمنوں کی من گھڑت کہانی ہے اور اسکا آخری حصہ تو بالکل بیہودہ
پایا ہے اور جو شعر بیان کیا جاتا ہے کہ کسی نے بزم میں اتفاقاً پڑھ دیا تھا الخ
کا مشہور شعر ہے۔ جو فیضی سے بہت عرصہ بعد ہوا۔ کہاں فیضی! اور

کہاں خواجہ حیدر علی آتش جو یہی شکل ہوئی ہے

چہ خوش گفت سعدی در زلیخا

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا

غرض شیخ نے وہ شہرت اور بلند آوازگی حاصل کی جو کسی مصنف کو ہنوز نصیب نہیں ہوئی چنانچہ خود شیخ نے گلستان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ذکر جمیل سعدی کہ در افواہ عوام افتادہ و صیت سخنش کہ در بسیط زمین اسکا وجود [illegible] سمجھا جاتا تھا اور جہاں کہیں وہ جاتا تھا لوگ اُسکے پا انداز میں آنکھیں بچھاتے تھے ؛

چونکہ شیخ کی تصنیف میں سرتاپا اخلاق اور تہذیب نفس کے مضامین مندرج ہیں اسلیے لوگوں کو اُس سے ایک خاص عقیدت اور ارادت پیدا ہوگئی تھی اور بڑے بڑے امراء و اعیان سلطنت اسکی زیارت کو سعادت دارین اور اس کے کلام کو تبرک سمجھتے تھے۔

شیراز میں جو شخص حاکم ہوتا تھا وہ شیخ کی نہایت تعظیم و تکریم کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ ادب سے پیش آتا تھا۔ سردار انکیانو جسکو شیخ نے اپنی کلیات میں پند و موعظت کا مخاطب ٹھہرایا ہے۔ شیخ کی حد سے زیادہ تعظیم و تکریم کیا کرتا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ شیراز میں سپاہیوں نے شیخ کے بھتیجے پر جو بقالی کی دکان کیا کرتا تھا اسکی دوکانداری کے متعلق کچھ جبر و تعدی کی۔ شیخ کو بھی اس معاملہ کی خبر ہوئی اُس وقت شیخ حضرت ابو عبداللہ ابن خفیف کی خانقاہ پر مجاوری کرتا تھا اُس نے ایک قطعہ شکایت لکھا جس میں اہل شہر کی شکایت اور اپنے بھائی کی دوکانداری اور پریشانی کا حال تھا۔ وزیر نے فوراً اس امر کا تدارک کیا اور خود شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی چاہی اور ... درم پیش کرکے عرض کی کہ یہ حقیر رقم بطور ہرجانہ آپ کے بھائی کے لیے ہے شیخ نے وہ بھائی کے پاس بھیج دی ؛

شیخ کی عزت اور قدر ممالک ایران، ترک، روم، مصر و دمشق، ملک شام اور عراق عجم اور ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور شیخ کا یہ دستور تھا اور شیوہ تھا کہ جیسا کہ نصیحت کرتا تھا اس بات کی اسکو کچھ پروا نہ تھی کہ اس کی یہ بات کسی کو کڑوی لگتی ہے یا میٹھی۔ بقول علی بن احمد جس طرح شیخ کھرا اور بے دھڑک پند و موعظت بادشاہوں کو کرتا تھا۔ وہ آجکل کے زمانہ کے مشائخ و علماء ایک تہائی حضرات کو بھی نہیں کر سکتے ۔

سردار انکیانو جو اباقا خاں کی طرف سے صوبہ فارس کا صوبہ دار تھا۔ اور جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے ایک بارعب و داب شخص تھا جسکی ہیبت اور دبدبہ سے بڑے بڑے با اختیار حاکموں کا زہرہ آب ہوتا تھا۔ شیخ کی کلام کو ہمیشہ تعظیم و تکریم کی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور اسکی تلخ نصیحتوں کو شہد سے زیادہ شیریں سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس امر کی تائید میں ہم نے دوسرے باب میں لکھا ہے کہ شیخ جامع مسجد دمشق میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی مرقد منور پر معتکف تھا عرب کا ایک بادشاہ جو ظلم اور بے انصافی میں مشہور تھا مسجد میں آیا اور نماز سے فارغ ہو کر شیخ کے پاس آیا اور کہا مجھکو ایک خوفناک غنیم کا اندیشہ ہے آپ میرے حق میں دعا کریں کہ مظفر و منصور ہو جاؤں۔ شیخ نے کہا کمزور رعیت پر رحم کر تا کہ زبردست دشمن سے محفوظ رہے ؎

ہر کہ تخم بدی کشت و چشم نیکی داشت
دماغ بیہودہ پخت و خیال باطل بست

ایک دفعہ عراق عجم میں ایک بادشاہ نے شیخ سے کہا کہ میرے حق میں دعائے خیر کرو۔ شیخ نے کہا یا خدا اسکی جان لے لے۔ اس نے حیران ہو کر پوچھا برائے خدا یہ کیا دعا ہے۔ شیخ نے کہا یہی دعا ہے تیرے حق میں دعا ہے ؎

ظالمی را خفتہ دیدم نیم روز
گفتم این فتنہ است خوابش بردہ بہ

شیخ کے دل میں بھی قوم کی خیرخواہی کا جوش اس شدت سے بھرا ہوا تھا کہ وہ اہل سلطنت کو بھی بالائے طاق رکھکر صاف صاف بادشاہوں اور امیروں کو کھری کھری سنا دیتا تھا اور چونکہ اسکی نیت میں نیکی ہوتی تھی اسکی تلخ گفتگو سے بادشاہ اور حاکم اور معتقد اور ارادتمند بنتے تھے۔

اتابک ابوبکر میں یہ سخت عیب تھا کہ وہ علما اور فضلا سے بدگمان رہتا تھا اور جاہل درویشوں اور خانہ بدوش فقیروں سے بہت عقیدت رکھتا تھا اس لئے اہل علم اس کے وقت میں اپنا کمال علمی ظاہر کرنے سے ڈرتے تھے اور اکثر جہلا کے لباس میں چھپے رہتے تھے۔ مگر شیخ نے کہ ایک مرد میدان تھا اگرچہ بمقتضائے مصلحت وقت دربار سے کنارہ کش رہا اپنی وضع کو ہاتھ سے نہ دیا اور آخر اتابک کو اسکی غلط فہمی سے آگاہ کرہی دیا۔ اگرچہ اس بادشاہ نے بہت سے علما کو ذلیل و خوار کیا تھا مگر شیخ سے ہمیشہ عزت کے ساتھ پیش آتا تھا اور سعد بن ابوبکر تو جس کے نام پر شیخ نے گلستان لکھی ہے اس کا خاص معتقد اور ارادتمند تھا۔

شیخ مرحوم نے گلستان میں ایک دلچسپ حکایت لکھی ہے جس میں بظاہر بیشتر اس کا فقیروں کے چاپلوس پر نکتہ چینی کی ہے اور جاہل درویشوں کی قلعی کس حد تک کھولی ہے اس حکایت میں اس نے صاف اتابک ابوبکر پر چوٹ کی ہے اور وہ حکایت یہ ہے کہ کسی جنگل میں ایک درویش رہتا تھا جو درختوں کے پتے کھاتا اور دن رات عبادت گاہ میں مشغول رہتا تھا ایک بادشاہ اُسکے حسن عقیدت سے شہر سے نکل کر اُسکی زیارت کو گیا اور عزت سے اس کو شہر میں لایا۔ بادشاہ نے درویش کے رہنے کے لئے ایک خاص محل جو خوب آراستہ تھا خالی کرایا اور نہایت خلوص کے ساتھ اُسکو وہاں اُتارا۔ جب درویش کو بجائے جنگل پھل پھول اور گھاس پات کے طرح طرح کے میوے اور لذیذ کھانے ملنے لگے اور نفیس کپڑے پہننے کو اور خوبصورت لونڈیاں

خدمت کرنے کو ملیں۔ آگے شاہ صاحب خاک پر فرش بچھایا کرتے تھے
اب مخمل و کمخواب کے نرم نرم گدیلوں پر استراحت فرمانے لگے۔ غرض شاہ صاحب نے
خوب روپیہ نکالا۔ ایک دن وزیر بادشاہ کی قدمبوسی کے لئے حاضر ہوا
بادشاہ نے کہا کہ جس قدر مجھے علماء و فضلاء اور زہاد سے عقیدت اور
محبت ہے اس قدر کسی اَور گروہ سے نہیں۔ وزیر با تدبیر نے عرض کی
کہ حضور شرطِ مروت یہ ہے کہ دونوں کے ساتھ نیکی کی جائے۔ علماء کو روپیہ
دینا چاہیے تاکہ اطمینان سے درس اور تصنیف میں مصروف رہیں اور زاہدوں
کو سوائے قوت لایموت کچھ نہیں دینا چاہیے تاکہ اُن کے زہد و تقوے
میں خلل نہ آئے۔ زاہدوں کو روپیہ دینا ان کے حق میں کانٹے بونا ہے
کیونکہ روپیہ ملنے سے وہ آرام طلب ہو جاتے ہیں۔ اور اُن کی عبادت اوقات
میں فرق آ جاتا ہے۔

گلستان کے اسی باب میں ایک اور چبھتی ہوئی حکایت ہے جس میں
ایک جو بکر پر چشمک ہے۔ شیخ نے لکھا ہے کہ ایک بادشاہ کو سخت مہم پیش
آئی اور اس نے منت مانی کہ اگر خدا نے مجھے مظفر و منصور کیا تو میں بہت
سا روپیہ زاہدوں کی نذر کروں گا۔ جب اسکی مراد پوری ہو گئی تو اپنے عہد کے
موافق روپیوں کی تھیلیاں غلام کو دیں کہ زاہدوں کو جا کر تقسیم کر آئے۔ غلام
بہت دانا تھا۔ تمام دن ادھر اُدھر پھر پھرا کر شام کو تھیلیاں ہاتھ میں لئے جیسے
گیا تھا ویسا ہی چلا آیا اور عرض کیا کہ قبلۂ حاجات تمام دن ڈھونڈا مگر کوئی
زاہد نہیں ملا۔ بادشاہ نے کہا۔ جھک مارتا ہے اس شہر میں سینکڑوں زاہد
بھرے پڑے ہیں۔ غلام زیرک نے عرض کی کہ حضور جو زاہد ہیں وہ تو لیتے
ہی نہیں اور جو لیتے ہیں وہ زاہد ہی نہیں۔ یہ سن کر بادشاہ ہنس کر خاموش
ہو گیا۔

غرض ایسی ایسی چوٹوں سے شیخ ہرگز نہ چوکتا تھا۔ وہ شیخ ہی کیا تھا۔ جو کہ

محافظ اتابک ابوبکر کا تھا۔ سعد اگر کوئی ایسی ویسی بات بھی منہ سے نکال دیتا تو وہ کپڑے کپڑے نکلوا لیتا۔ کہتے ہیں ایک دفعہ اتابک ابوبکر نے شیخ سے کہا کہ آپ مسند قضات پر جلوہ افروز ہو کر ہمیں ممنون فرمادیں۔ شیخ نے کہا کہ میں اس منصب کے لائق نہیں۔ اتابک نے وجہ پوچھی۔ شیخ نے کہا اگر میں نے سچ کہا ہے تو مجھے معاف رکھیے اور اگر میں نے دروغ کہا ہے تو دروغگو کو قاضی نہیں بنانا چاہیے۔ اتابک ہنس کر خاموش ہو گیا۔ دراصل یہ واقعہ امام ابوحنیفہؒ سے متعلق ہے۔

خواجہ شمس الدین جوینی صاحب دیوان اور انکا چھوٹا بھائی خواجہ علاء الدین جوینی کو دجہ ہلاکو خاں کے پسر اباقا خاں کے معتمد وزیر اور نائب السلطنت تھے۔ ان کو شیخ کے ساتھ خاص عقیدت اور ارادت تھی۔ ایک روز شیخ مرحوم حج سے واپس آتے ہوئے تبریز سے گذرے۔ راہ میں اباقا خاں کی سواری آتی تھی۔ یہ دونوں بھائی بھی اس کے ساتھ تھے۔ ان کا شیخ کو دیکھنا تھا کہ فوراً گھوڑوں سے اتر کر شیخ کے پاس آئے اور نہایت مؤدب ہو کر شیخ کے قدم لئے اور ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ بادشاہ نے حیران ہو کر پوچھا کہ یہ کون ہے جسکی ہم سے بھی زیادہ تعظیم کی گئی ہے۔ انہوں نے کہا حضور یہ ہمارا شیخ ہے سعدی اس کا نام ہے۔ اسی کا نام اور اسی کا کلام تمام عالم میں مشہور و معروف ہے چنانچہ اباقا خاں نے بھی شیخ سے ملاقات کی اور شیخ کی خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔

شیخ کی عقیدت کے بارہ میں بعض لوگ یہاں تک بیان کرتے ہیں کہ ملتان میں رکن عالم صاحب نبیرۂ شاہ بہار الحق صاحب نے شیخ سے بیعت کی تھی اور تصوف میں شیخ مرحوم ہی سے سبق لیا تھا اور سلطان غیاث الدین بلبن کے بیٹے خان شہید نے جو ناظم ملتان تھا شیخ کو یہ لکھا کہ جناب شیراز سے ملتان تشریف لائیں اور اپنے قدوم میمنت لزوم سے میرے مکان کو آباد اور میرے دل کو شاد فرمائیں

ولیم اوسلی ایل ایل ڈی بے جو سر گور اوسلی سفیر ایران کا پرائیویٹ سکریٹری تھا
اپنے سفرنامہ ممالک مشرقیہ میں جو غالباً اس نے سنہ ۱۸۱۱ء میں تحریر کیا لکھا ہے کہ
شیراز میں جہاں تھا کے قریب ایک مقام ہے جسکو چہل تن کہتے ہیں اور
اسکے قریب ایک اور مقام ہے جسکو ہفت تن کہتے ہیں کیونکہ اسمیں سات درویشوں
کی قبریں ہیں۔ اس مقام کے ساتھ ایک باغ ہے جس میں بیشمار سرو کے درخت
ہیں۔ ہفت تن کے ایک بالائی کمرہ میں سعدی اور حافظ کی تصویریں لٹکی ہیں
یہ تصوریں اگرچہ خیالی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر ایسے ملک میں بنائی گئی ہیں
جہاں یہ دونوں صاحب کمال پیدا بھی ہوئے اور فوت بھی ہوئے۔ پس
ممکن ہے کہ اسکی کچھ نہ کچھ اصلی صورت کے ساتھ مشابہت ہو۔ شیخ کے مقبرہ
پر ابتک سینکڑوں شیخ کے معتقد زائرین کر جاتے ہیں اور وہاں چہارشنبہ
کے دن درویشوں کا میلا لگا رہتا ہے۔ صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ جب
میں وہاں گیا تو درویش کثرت سے اس مقام میں موجود تھے اور ایک عجیب
طرح کی بدبو وہاں سے آتی تھی میں نے اس بدبو کا حال دریافت کیا تو میرے
ہمراہی نے مجھے یقین دلایا کہ یہ بدبو اُن درویشوں کے میلے کپڑوں کی آ رہی
ہے جو کثرت سے یہاں جمع ہیں۔ یعنی شیخ کی عقیدت کا اب بھی یہ عالم ہے
کہ ابتک اس کے مدفن پر میلا لگا رہتا ہے۔ وہ رستہ جو شیخ کے مقبرہ کو جاتا
ہے شیخ ہی کے نام پر پُل سعدی کہلاتا ہے۔ سر ولیم یہ بھی لکھتے ہیں کہ شیخ
کے مقبرہ کا جو بیرونی دروازہ ہے وہ اس قدر نیچا ہے کہ میانہ قد کا آدمی
بھی جھکے بغیر اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ اور یہ دروازہ دانستہ اس قدر
نیچا رکھا گیا ہے تاکہ زائرین ادب سے جھک کر اندر داخل ہوں اور
کوئی شخص گھوڑے پر سوار ہو کر اندر نہ آ سکے۔ جس کے باعث بے ادبی
ہو۔ لوگوں کے دل میں شیخ کی اس قدر عظمت اور بزرگی ہے۔ مقبرہ کے
ساتھ ایک چھوٹا سا تالاب ہے جس کو ابتدا میں تالاب سعدی کہتے تھے

گرداب اسکو سعدیہ کہتے ہیں۔ اس تالاب میں طرح طرح کی مچھلیاں بکثرت
ہیں جن کے نتھنوں میں بعض معتقدان شیخ نے سونے کی نتھلیاں ڈالی
ہوئی۔ کیا مجال کسی کی جو ان سے مچھلی پکڑے یا اُن مچھلیوں کو کسی قسم کی
ایذا دے۔ یعنی شیخ کی تقدس مآبی کا یہانتک شہرہ ہے کہ لوگوں کو ہر حال
میں اسکا ادب ملحوظ خاطر رہتا ہے ؛

بیان پلٹس صاحب نے لکھا ہے کہ بعض معتقدان شیخ اسکو ولی سمجھتے تھے
اور ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ جب شیخ نے شہر کے باہر عالیشان عمارت
یا خانقاہ بنوائی تو دن رات وہیں رہنے لگا۔ اس خانقاہ میں بڑے بڑے
شہزادے۔ امراء اور سردار شیخ سے ملنے آجاتے تھے اور اس کے لئے کھانا
بھیجا کرتے تھے۔ شیخ کا دستور تھا کہ روٹی کے تین حصے کیا کرتا تھا۔ ایک
حصہ آپ کھا لیا کرتا۔ دوسرا حصہ فقیروں اور محتاجوں کو دیدیا کرتا تھا اور
ایک حصہ ایک چھینکے یا طشت میں جو دروازہ پر لٹکا رہتا تھا۔ رکھدیا کرتا تھا
تاکہ غریب لکڑہارے جب دن بھر لکڑیاں کاٹ کاٹ کر تھک جائیں تو وہ روٹی
کھاویں اور تازہ دم ہو جاویں۔ ایک دن ایک چور لکڑہاروں کا بھیس کر کے
وہاں آیا جب اس نے تھیلے کے اندر ہاتھ ڈالا تو وہاں کسی چیز نے زور سے
اس کا ہاتھ پکڑ لیا چور نے ہر چند ہاتھ چھڑانا چاہا مگر کوئی پیش نہ گئی۔ ناچار
ہو کر دوہائی دی کہ شیخ صاحب آئیے اور مجھے چھڑائیے۔ شیخ مرحوم نے باہر
آکر پوچھا تو کون ہے۔ چور نے کہا بندہ غریب لکڑہارا ہے۔ اگر تو لکڑہارا ہے
تو تیرے ہاتھوں میں کلہاڑی کے نشان کیوں نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تو چور
سینہ زور ہے۔ اب لگاؤ زور۔ دیکھوں آپ کی سینہ زوری۔ چور نے منت
خوشامد کی اور آئندہ توبہ کی۔ چنانچہ شیخ کے اشارہ پر تھیلے نے چھوڑ دیا ؛

ہم کہتے ہیں کہ شائد شیخ نے تھیلے میں کوئی حکمت رکھی ہوگی جس سے اس
نے لکڑہاروں کو آگاہ کر رکھا ہوگا۔ چور کو وہ حکمت معلوم نہ تھی اسلئے اُس کا ہاتھ

بس گیا ہوگا ؛

ہانس ڈیغربری لکھتے ہیں کہ شیخ کے معتقدین نے اسکی تقدس مآبی کی نسبت اس قدر مبالغہ کئے ہیں کہ اسکو کسی ناول کا ہیرو کہنا چاہئے ؛

فاضل سلوسیٹری ڈی ساسی صاحب لکھتے ہیں کہ ۔ شیخ ہمیشہ ایسے شخصوں سے سخت نفرت کرتا تھا جو شی کی آڑ میں شکار کھیلتے ہیں ۔ وہ اس قسم کے ریاکار زاہدوں کو سخت بُرا جانتا تھا جو زاہدوں کا لباس پہنکر لہو و لعب میں مشغول ہو جاتے ہیں ؛

شیخ کی بزرگی لوگوں کے دلوں میں اب تک اس قدر ہے کہ گلستان اور بوستان کو نستعلیق اور خوشخط سنہری روپہری جدولوں میں لکھوا کر اور بیش بہا جلدوں میں بند ہوا کر اپنے کتب خانوں اور الماریوں میں رکھتے ہیں ؛

لاہور کی پنجاب پبلک لائبریری میں جہاں ایک بے انتہا ذخیرہ کتابوں کا اس وقت موجود ہے داخل ہونے پر سب سے پہلے شیخ کا شعر ایک بوقلم سے لکھا ہوا نظر پڑتا ہے اور وہ شعر یہ ہے ؎

پے علم چوں شمع باید گداخت
کہ بے علم نتواں خدا را شناخت ؛

صدیاں گذر گئیں ۔ زمانے نے لاکھوں رنگ بدلے ۔ وقت نے پلٹے کھائے ۔ صفحہ ہستی کے ورق الٹ گئے ۔ اور قانون قدرت کے دو ورق آسمان و زمین بھی ویسے کے ویسے نہ رہے ۔ مگر گلستان کے ورق الٹ کر دیکھو ۔ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح یہ اس وقت اپنی حکایتوں اور معنی خیز حکمتوں کے باعث مقبول خاص و عام اور واجب العمل تھی ویسے ہی آج بھی دستور العمل بنانے کے قابل ہیں ؛

شیخ کی تصنیف نے قبولیت عام سے بقائے دوام کا ایک الماس مرصع تاج شیخ کے فرق مبارک پر دھرا ہے ۔ جو مہر اصفہانی اور نیرۂ شیراز کے ناموں کے ساتھ ساتھ دنیا کے اختتام تک جائیگا اور اسکی لسانی اور جادو بیانی

سے شہرت عالمگیر کا ایک ایک نوکھا ہر گلی کوچہ میں بیٹھا ہے جب تک ملک عثمان اور شیراز کے نام میں شیخ سلامت رہیگا۔

چھٹا باب

شیخ کی تصنیف پر رائے

شیخ علیہ الرحمۃ کا کلام بقول پروفیسر اِتھی سب سے پہلے شیخ علی بن احمد نے شیخ کی وفات سے چالیس برس کے بعد مرتب کیا ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ شیخ کی مکمل کلیات نہیں ہے یعنی علاوہ اس کلام کے جو علی بن احمد نے جمع کیا شیخ کا اور بہت سا کلام تھا جو کسی کو جمع کرنے کا خیال نہ آیا اور ردیوں میں ضائع ہوا۔ موجودہ مشہور کلام کی تفصیل یہ ہے:-

غزلیات:
- (۱) طیبات یعنی غزلیات کا پہلا دیوان
- (۲) بدایع یعنی غزلیات کا دوسرا دیوان
- (۳) خواتیم یعنی تیسرا دیوان
- (۴) مجموعہ غزلیات

قصائد:
- (۵) قصائد فارسی
- (۶) قصائد عربی

- (۷) مراثی
- (۸) ملمعات
- (۹) مثلثات
- (۱۰) ترجیعات
- (۱۱) مثنویات و صاحبیہ

(۱۲) قطعات
(۱۳) رباعیات } صاحبیہ
(۱۴) مفردات
(۱۵) مطائبات و ہزلیات ؛
(۱۶) پند نامہ یعنی کریما
(۱۷) بوستان ؛
(۱۸) گلستان ؛
(۱۹) رباعیات ؛

ان رسالوں میں سلوک اور تصوف کے مضامین اور مشائخ اور عارفوں کی حکایتیں اور بادشاہوں اور اعیان سلطنت کی نصیحتیں درج ہیں ؛

علاوہ ان کے قریب سو کے شیخ کی تصنیفات اور ہیں جو ہندوستان میں مشہور نہیں مثلاً بقول مسٹر ہمبرگ سعدی کی سب سے بڑی کتاب سلطنت عباسیہ کی چھ سو برس کی تاریخ ہے جو سنہ ۱۶۸۱ء میں پہلے لاطینی میں ڈیوڈ موسے نے ترجمہ کی اور کنگ ایسٹن نے سنہ ۱۷۱۱ء میں پیرس میں ترجمہ کی۔ دوسری کتاب کا نام جواہر افراقہ ہے۔ اسکی بھی چار جلدیں ہیں وغیرہ وغیرہ ؛

علی بن احمد جامع کلیات شیخ کی رائے غزلیات شیخ کی نسبت یہ ہے کہ جب اسکی غزلیات مجالس سماع میں گائی جاتی ہیں تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ عاشق تمام بے ہوش اور از خود فراموش ہو جاتے ہیں ؛

مولانا عبدالرحمن جامی کی شیخ کی غزلیات کی نسبت مضمون ذیل لکھا ہے

در شعر سہ کس پیمبرانند ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را فردوسی و انوری و سعدی

امیر خسرو دہلوی نے یوں رشک ظاہر کیا ہے۔

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

خواجہ مجد الدین ہمگر کی یہ رباعی ہے :-

اگرچہ بہ نطق طوطئے خوش نفسیم

بر شکر گفتہائے سعدی مگسیم

در شیوۂ شاعری بہ اجماع اُمم

ہرگز من و سعدی بجامی نرسیم

اس رباعی کے متعلق ایک روایت بھی ہے جس کا ذکر اس موقع پر ہماری رائے میں خالی از لطف نہ ہوگا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن خواجہ شمس الدین صاحب دیوان امیر معین الدین پروانہ حاکم روم۔ ملک افتخار الدین کرمانی اور مُلّا نور الدین سعدی باہم صلاح کرکے خواجہ مجد الدین ہمگر کے پاس آئے جو شیخ علیہ الرحمۃ کا جلیل القدر معاصر تھا اور شیخ علیہ الرحمۃ کے کلام پر محاکمہ کی درخواست کی چنانچہ جواب میں مجد ہمگر نے یہی رباعی پڑھ دی جو ہم اوپر درج کر آئے ہیں رفتہ رفتہ یہ رباعی شیخ تک بھی جا پہنچی۔ شیخ کی زبانی مشہور تھی اس لئے جواب میں ایک رباعی کہی جو فوراً چاروں طرف مشہور ہو گئی اور وہ رباعی یہ ہے :-

ہر کس کہ بپایگاہ سامی نرسد

از بخت سیاہ و بدکلامی نرسد

ہمگر کہ بعمر خود نکردہ است نماز

شک نیست کہ ہرگز بامامی نرسد

حاجی لطف علی خاں آذر کی یہ رائے ہے کہ شیخ پیغمبر غزل ہے اور فردوسی انوری اور نظامی کے سوا کسی کی مجال نہیں کہ جو شیخ کی برابری کا دعوے کرے چنانچہ حاجی موصوف کو مجد ہمگر کا امامی کو شیخ پر ترجیح دینا بھی ناگوار گذرا ہے اور اُس نے یہ قطعہ کہکر دل کا بخار نکالا ہے :-

یکے گفت امامی امام سخن است

بسعدی فضول یاوہ مجد ہمگر

میں ماجرا چو بیت سنائے تو گفتہ
شمر از عجب دو عنبر سنگ

جان پیٹ نے جو انشا گزر پارس ممالک متوسط تھا حیات سعدی میں جو نظم کے ترجمہ سے گزر رہی میں ہے لکھا ہے کہ سعدی غزل کا مسلم الثبوت استاد تھا اس سے پہلے کسی نے ایسے اشعار نہیں کہے جنکو واقعی غزل کہا جائے شیخ کا دیوان ملک ان شعرا اور شیخ کا خطاب ممالک مشرق میں بلبل ہزار داستان ہے۔

اس میں شک نہیں کہ شیخ نے اپنی جادو بیانی سے غزل میں ایک نئی لذت پیدا کر دی ہے اگرچہ ظہیر خاقانی اوحدی انوری وغیرہ کی غزلیات موجود تھیں مگر شیخ نے اس میدان میں ایسے عجیب و غریب گل کھلائے کہ سب کی [illegible] پڑ گئے۔

میری رائے میں شیخ کی غزلیات میں مفصلہ ذیل خصوصیتیں ہیں۔

(۱) شیخ کی غزلیات میں کلام کی سادگی سے فکر کو بجائے کاوش کے لذت حاصل ہوتی ہے۔ اسواسطے اسکی غزلیات خاص لوگوں میں پسند اور عوام میں ہر دلعزیز ہیں۔

(۲) غزلیات میں زبان ایسی شستہ اور صاف استعمال کی گئی ہے کہ گویا سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں اور دل کے خیالات کو جو سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں محاورہ اور رنگ دیکر باتوں باتوں میں اسطرح ادا کیا ہے کہ وہ باتیں مضمون بن گئیں۔

(۳) شیخ نے غزلیات میں بحریں ایسی اختیار کی ہیں جو تغزل اور قافیہ کے لئے نہایت موزوں اور مناسب ہیں یعنی شیخ کی غزلیات ہر بحر میں کہیں شربت اور کہیں شیر شکر ہیں اور بعض اوقات آب حیات بن جاتی ہیں اس لئے جو لفظ منہ سے نکلتا ہے تاثیر میں ڈوبا ہوا نکلتا ہے۔

(۴) غزلیات کے مضامین زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ ہم شوخ کے لئے خیال

تھے عالی تھے جہاں کہیں تو نظم رویا ہے وہاں ایسے مضامین استعمال
کئے ہیں جن سے دلوں میں اثر اور سینوں میں درد پیدا ہوتا ہے جنکے لفظ
لفظ سے ناکامی اور دردار مانے اور جن کے حرف حرف سے حسرت اور مایوسی ٹپکتی
ہے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کا دل غم و درد کا پتلا یا حسرت واندوہ کا
مجسمہ تھا اور جو سننے والوں کے دل پر نشتر کا کام کر جاتے ہیں جہاں کہیں عیش و
نشاط کے مضامین کو لیا ہے وہاں لفظ لفظ سے خوش طبعی اور حرف حرف سے
ظرافت برستی ہے اور یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے شراب ناب کے سرور میں
گل افشانی کی ہے ؛

(۵) شیخ نے غزلیات میں فصاحت و سادگی پر ایک شوخی اور بانکپن کا انداز
ایسا بڑھایا کہ جس سے پسند عام نے شہرت دوام کا فرمان دیا ہے جس سے عوام
الناس میں دھوم مچ گئی اور خواص مان گئے کہ یہ طرز انہیں کی ایجاد ہے ؛

(۶) مضامین کی رنگینی محاوروں کی نمکینی سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کو زبان پر
قدرت کامل تھی یعنی شیخ کی غزلیات تازگی مضمون صفائی کلام خوبی ترکیب
خوبی محاورہ اور عام فہمی کی صفات سے متصف ہیں ؛

(۷) شیخ کی غزلیات ہر پہلو سے مرغوب طبایع خاص و عام ہیں درویش خصلت
و فقیر مزاج لوگوں کے لئے وہ ایک تصوف و عرفان کا دریا ہیں اور غیر متشرع
رند مشرب اور آزاد لوگوں کے لئے یہ ایک ہوش ربا مینا ہیں ؛

(۸) شیخ نے تشبیہ اور تمثیل سے غزلیات میں ایسی دستکاری اور جنانگاری کی
ہے کہ اس سے لفظوں میں شوکت اور کلام میں بلاغت پیدا ہو گئی ہے ؛

شیخ نے بھی عاشقانہ اشعار کی بنا امردوں اور سادہ رخوں کے عشق پر رکھی
ہے اسی بنا پر بعض شخص شیخ پر امرد پرستی کا الزام لگاتے ہیں چنانچہ اس
امر کی تائید میں جان بشر نے سعدی کی اس نوک جھونک کا ذکر کیا ہے جو
تبریز کے حمام میں ہمام الدین تبریزی کے ساتھ ہوئی وہ قصہ اس طرح سے ہے

جب شیخ علیہ الرحمۃ تبریز میں گیا تو اس نے ہمام تبریزی کا بہت شہرہ سنا
کسی نے شیخ سے یہ بھی کہہ دیا کہ اسکا ایک لڑکا یوسف ثانی ہے مگر ہمام اس کو
پردہ میں رکھتا ہے اور غیر اور اجنبی اشخاص سے اسکو ملنے نہیں دیتا شیخ
کو اس کے حسن و جمال کا شہرہ سنکر غائبانہ اشتیاق پیدا ہوا غرض اسی مطلب
کیلئے شیخ پہلے سے جاکر ایک حمام میں چھپ رہا جس میں اس دن ہمام مع اپنے
پسر کے غسل کو جانیوالا تھا خواجہ ہمام اور اسکے لڑکے کے داخل حمام ہوتے ہی
شیخ صاحب گلیم درویشی اوڑھ کر سامنے کھڑے ہو گئے خواجہ ہمام کو شیخ کی یہ حرکت
بہت سخت ناگوار گذری اپنے لڑکے کو اپنے پیچھے چھپا لیا اور لڑکے کے آگے آپ
کھڑا ہو گیا پھر شیخ کو جھڑک کر بولا تو کہاں سے آیا ہے۔ شیخ نے جواب دیا خاک
پاک شیراز سے۔ ہمام نے جواب دیا کہ اس ملک میں شیرازی تو کتے کے برابر ہے
شیخ نے کہا ٹھیک ہے مگر شیراز میں تبریزی کتوں سے بد تر سمجھے جاتے ہیں۔
اسی طرح کچھ عرصہ تک شیخ میں اور خواجہ میں نوک جھونک ہوتی رہی آخر خواجہ
لاجواب ہو گیا اور منفعل ہو کر کہنے لگا۔ اچھا بتلائیے کہ شیراز میں خواجہ ہمام تبریزی
کے اشعار بھی مشہور ہیں یا نہیں۔ سعدی نے کہا بیشک مشہور ہیں اور ایک
مقطع پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ہمام میرے درمیان اور میرے معشوق کے
درمیان ایک پردہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ بیچ میں سے یہ پردہ ہٹ جائیگا۔
خواجہ ہمام نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ آپ سعدی ہیں۔ شیخ نے کہا۔ بیشک ا
اسپر خواجہ نے معذرت کی اور کہا کہ معاف رکھیے میں نے پہلے نہیں پہچانا تھا
اس کے بعد اس نے شیخ کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور اپنے لڑکے کو شیخ کی دست
بوسی کا اشارہ کیا اور کئی دن تک مہمان رکھ کر بڑی دھوم سے عزت کی۔
شیخ کی غزلیات کو پڑھ کر اسپر امرد پرستی کا الزام لگانا میری رائے ناقص
میں انصاف کا گلا کند چھری سے ریتنا ہے۔ صرف شیخ ہی نے تغزل کی بنیاد
امردوں اور سادہ رخوں کے عشق پر نہیں رکھی ہے۔ بلکہ کل ایران میں

بھی پشت شعرا ہے اور آجکل کی اردو شاعری بھی اسی کے نقش قدم پر چل رہی
ہے۔ عرب کی شاعری میں شاعروں نے معشوق عورت باندھا اور ہندی شاعری
میں عورت کا عشق مرد کی طرف جتایا جاتا ہے۔ مگر ایران والوں نے ایک نئی
روش اختیار کر لی ہے۔ یعنی مرد کو مرد کا عاشق فرض کر لیا ہے۔ عرب کی اور
ہند کی شاعری بیشک نیچر کے مطابق ہے اور ایران کی شاعری بادی النظر میں
خلاف فطرت انسانی مذموم اور قبیح معلوم ہوتی ہے مگر درحقیقت بات یہ ہے
کہ فارسی زبان میں عربی اور ہندی زبان کی طرح تذکیر و تانیث کی تمیز نہیں
ہے اسمیں ضمائر افعال اور صفات مرد اور عورت دونوں کیلئے یکساں لائے
جاتے ہیں اس لئے ممکن ہے کہ ایرانیوں نے بھی ہندی شاعری کی طرح
اپنے آپ کو عورت اور معشوق کو مرد قرار دیا ہو۔ قطع نظر اس کے اگر یہ تسلیم بھی
کر لیا جائے کہ ایران والوں نے عاشقانہ اشعار کی بنیاد امردوں اور سادہ
رخوں کے عشق ہی پر رکھی پھر بھی کوئی گناہ لازم نہیں آتا۔ کیونکہ یہ ضروری
نہیں ہے کہ جو فارسی کہے وہ ضرور امرد پرست ہو۔ یہ صرف ایرانیوں نے
برائے نام ضابطہ ٹھیرا لیا ہے ورنہ ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ اکثر شاعر جو پارسا
اور پرہیزگار ہیں اور جنہوں نے نہ کبھی شراب کا مزہ چکھا ہے۔ نہ اس کی
بو تک سونگھی ہے سینکڑوں ورق شراب اور کباب کے مضامین میں سیاہ
کر دیتے ہیں اور ہزاروں پاکباز اور عفت مآب دم بھر کے لئے صرف شاعری
کی خاطر امرد پرست اور شاہد باز بنجاتے ہیں۔

مزید برآں کسی پر عاشق ہونا یا کسی کو اپنا معشوق گرداننا یہ معنی نہیں رکھتا
کہ ضرور معشوق سے لذات نفسانی اور بہائمی کا پورا کرنا مقصود ہو اگر عشق بازی
کا مدعا صرف یہی ہے تو وہ عشق بازی صرف بوالہوسی ہے۔ میری رائے میں
عشق مجازی عشق حقیقی کا پہلا زینہ ہے۔ عاشق کو معشوق کی صفات کا عشق
ہوتا ہے نہ کہ اس کی ذات کا مثلاً جو عاشق حسن و جمال ہے وہ ہمیشہ حسن

و جمال پر عاشق ہوگا خواہ وہ عورت ہیں اُنکے نسبت خواہ مرد ہیں بلکہ وہ
زیادہ امرد پر عاشق ہوگا۔ کیونکہ اُس میں گنہگاری کا کم خدشہ ہے اور عورت
کے عشق میں جو قدرت نے مرد کے لئے وضع کی ہے خلاف شرع حرکت کے واقع
ہونے کا زیادہ تر احتمال ہے۔

اس میں کچھ کلام نہیں کہ عشق و محبت اُسکی سرشت میں تھی اور اکثر امردوں
اور سادہ رخوں کی طرف اُسکا میلان خاطر تھا جیسا کہ لطف علی بیگ نے آتشکدہ
میں ہمام تبریزی کی حکایت میں لکھا ہے مگر وہ امردوں کا عاشق نہ تھا۔ وہ
صرف اُن کی خوش وضعی کا شیدا تھا۔ اور وہ بھی اس درجہ تک جہاں تک
صوفی اور سالک کو ترقیٔ باطنی کے لئے ضرورت ہے۔ شیخ علیہ الرحمۃ ناپاک
عشق بازی، ریاکاری، مکر و سالوس اور ہوا و ہوس سے کوسوں بھاگتا تھا
اُس نے خود ایک موقع پر کہا ہے

گر نظر صدق را تمام گنہ می خند
حاصل ما ہیچ نیست جز گنہ اندوختن

غزلیات

ایکہ آگاہ نہ عالم درویشان را — تو چہ دانی کہ چہ سودا و سر است ایشان را

گنج آزادی و کنج قناعت ملکیست — کہ بشمشیر میسر نشود سلطان را

طلب منصب فانی نکند صاحب عقل — عاقل آنست کہ اندیشہ کند پایان را

جمع کردند و نہادند و بحسرت رفتند — وین چہ دارد کہ بحسرت بگذار دآں را

دل ازل بود کہ پیماں محبت بستند — نشکند مرد اگرش سر برود پیماں را

عاشقے سوختہ بے سر و ساماں دیدم — گفتم اے یار کس ہم فکرت جاں را

نفسے سرد برآورد و ضعیف آمد رو — گفت بگذار من بے سر و ساماں را

پند ولغد تو در گوش من آید ہیہات — منکر بردہ دو نیم چہ کنم دیاں را

برادران طریقت نصیحتم مکنید — کہ توبہ در رہ عشق آبگینہ بشکست

وگر بہ خفیہ نمی باشدم شراب سماع — کہ نام شیشک بر نزدیک عاشقاں ننگ ست

چہ تربیت شنوم یا چہ مصلحت بینم — مرا کہ چشم بساقی و گوش بر چنگ ست

بخشم رفتۂ یار اکے برد پیغام — بیا کہ با سپر انداختیم گر جنگ ست

بیاد کار کسے دامن نسیم صباح — گرفتہ ایم و چہ حاصل کہ باد در چنگ ست

بکش چنانکہ تو دانی کہ بے مشاہدہ ات — فراخنائے جہاں بر وجود ما تنگ ست

ملامت از دل سعدی فرو نشوید عشق

سیاہی از حبشی چوں رود کہ خود رنگ ست

شیخ کے قصاید جہاں تک میرا خیال ہے پھیکے ہیں۔ ان میں مطالب کی وقعت مضامین کی بلند پروازی الفاظ کی شان و شکوہ اور بندش کی چستی جو لازمۂ قصائد ہے معدوم ہے۔ شیخ کی قصیدہ گوئی کا ڈھنگ ہی نرالا ہے۔ شیخ نے قصیدہ کو دنیاداروں کو خاطر خواہ وعظ، تنبیہ اور پند موعظت کرنے کا وسیلہ اور ذریعہ بنایا ہے۔ چنانچہ شیخ کے جتنے قصیدہ ہیں۔ اُن میں برائے نام مدح و ستائش ہے اور در اصل پند و نصائح سے بھرے ہوئے ہیں۔

بعض قدر شناسانِ سخن کا قول ہے کہ غزل اور قصیدہ کے دو میدانوں میں زمین اور آسمان اور یا یوں کہو دن اور رات کا فرق ہے اور قصیدہ طبیعت کی شگفتگی اور جوش و خروش کا ثمرہ ہوتا ہے اسلئے شیخ کو جنکی طبیعت قدرت سے سادگی پسند تھی قصیدہ لکھنا نہ آتا تھا۔ مختصر لکھکے کہ ہم بیان کریں کہ یہ ریمارک کہانتک درست ہے۔ ہم ذرا وضاحت کے ساتھ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ کیوں اور کس سبب سے شیخ کے قصائد پھیکے ہیں۔

(۱) شیخ کے قصائد میں الفاظ کی شان و شکوہ اور تکلف معدوم ہے۔ یعنی شیخ کے کلام میں اس قدر سادگی اور بے تکلفی ہے کہ جو قصائد کے لئے مذموم ہے۔

بیہودہ قصائد میں مبالغہ اور خوشامد سے زیادہ کام لیا جاتا ہے مگر شیخ کے قصائد میں یہ بات مطلق نہیں ہے۔ شیخ نے آزادی اور حق گوئی کو زیادہ لیا ہے۔

(۳) قصائد میں شاعر علم و فضل کے اظہار کے لئے مسائل فلسفہ دقائق تصوف معتقدات و نکات اصطلاحات منطق داخل کر لیتے ہیں اور شیخ نے ایسے دکھانے سے پرہیز کیا ہے۔

(۴) صنائع لفظی خصوصاً تجنیس و ترجیع اور تشبیہ و استعارات کا استعمال قصاید کا زیور سمجھا جاتا ہے مگر شیخ نے ان سب کو چھوڑ کر سادہ بیانی کو لیا ہے۔

(۵) عموماً قصائد حصول تقرب سلطانی ترقی درجات اور اجتماع مال و منال اور مزید برآں تسخیر شہرت کا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔ مگر شیخ نے اُن کو پند و موعظت کا وسیلہ قرار دیا ہے۔

اصل قصیدہ سے مغائرت کے بواعث مفصلہ ذیل ہیں:

(۱) حق گوئی جو اسکی طبیعت میں ودیعت کی گئی تھی تکلفات لایعنی سے مانع تھی۔

(۲) شیخ بیجا خوشامد اور مبالغہ کو نہایت ناپسند کرتا تھا۔

ظہیر فاریابی نے قزل ارسلان کی مدح میں ایک جگہ کہا ہے ؎

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پائے
تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلان زند

شیخ نے اتابک ابوبکر سعد کی تعریف میں ظہیر فاریابی کے شعر کی اس طرح تعریض کی ہے ؎

براہ تکلف مرو سعدیا — اگر صدق داری بیار و بیا
تو منزل شناسی و شہ راہ رو — تو حقگوے و خسرو حقایق شنو
چہ حاجت کہ نہ کرسی آسمان — نہی زیر پائے قزل ارسلان
مگو پائے عزت بر افلاک نہ — بگو روئے اخلاص بر خاک نہ

(۱۴) شیخ ہمیشہ دنیا داروں کو ناپسند کرتا تھا اور ... کو کسی حالت میں بھی شاعری اور خود پسندی اور خود بینی اس کے نزدیک شاعر کے لئے عار تھی۔

(۱۵) شیخ کی تمام عمر پند و موعظت میں صرف ہو گئی اور نصیحت کیلئے عام فہم اور سلیس عبارت درکار ہوا کرتی ہے۔

(۱۶) شیخ کی استقامت اور سنجیدگی اس امر کی مقتضی نہ تھی کہ وہ دریوزہ گری کرے۔ اسکو توکل اور قناعت بندہ کی خوشامد کی اجازت نہ دیتی تھی چنانچہ ایک قطعہ میں اس نے خود کہا ہے کہ لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ سعدی تو کیوں صعوبتیں جھیلتا ہے اور تکلیفیں اٹھاتا ہے۔ تو اوروں کی طرح اپنے کمال شاعری سے کیوں متمتع نہیں ہوتا؟ اگر تو مدح گوئی اختیار کرے تو نہال ہو جائے مگر مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ گداؤں اور فقیروں کی طرح امیروں وزیروں کے دروازہ کھٹکھٹاتا پھروں۔ ہاں اگر ایک جو جو ہنر کے عوض میں مجھے کوئی خو ... بخشدے تو وہ مستحق ثنا ہے اور میں قابل اعتراض ہوں۔

شیخ موصوف نے جو قصائد لکھے ہیں وہ محض محبت اور خلوص سے لکھے ہیں خوشامد کی راہ سے یا صلہ انعام کے بھروسہ پر نہیں لکھے۔ شیخ کے نزدیک اوصاف قصیدہ حسب ذیل تھے۔

(۱) ممدوح کی تعریف ایسے الفاظ میں کیجائے جسکو دیکھ کر اس کے مخالفین اسے ہجو ملیح سمجھ کر خندہ زن نہ ہوں۔

(۲) ممدوح کی تعریف بلا مبالغہ ایسے الفاظ میں کیجائے جن سے خاص و عام کے دل میں اسکی محبت جا نشین ہو اور اسکی نسبت حسن ظن پیدا ہوئے

(۳) ممدوح ایسے الفاظ سے مخاطب کیا جاوے جن سے وہ نیکی انصاف اور ترقی کی طرف راغب ہو۔

ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ نے قصیدہ کے میدان میں ایک نئی منزل تیار کر دی۔ اس نے اس راہ کو نہیں لیا جس پر اساتذہ سلف چلتے تھے

پس یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شیخ میں قصیدہ گوئی کی لیاقت نہ تھی بلکہ ہر قسم
کی تحریر پر قادر تھا مگر وہ قصیدہ کے تدریجی اصول کو پسند نہ کرتا تھا۔

الغرض اگر شیخ کے قصاید اس اصول کی رو سے دیکھے جاویں جو قدیم اساتذہ
نے قائم کیا ہے تو پھیکے اور قصیدہ کے زینہ سے گرے ہوئے ہیں لیکن حق گوئی
اور آزادی کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہیں۔

شیخ کے قصائد اکثر ایسے ہیں جو کسی مدح میں نہیں ہیں۔ ان میں صرف نصائح
اور اخلاق مندرج ہیں چنانچہ حسب ذیل بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

اے دل بکام خویش جہاں را تو دیدہ گیر
در وے ہزار سال چو نوح آرمیدہ گیر
بستان و باغ ساختہ گیر اندرو بسے
ایوان و قصر سر بفلک برکشیدہ گیر
با دوستان مشفق و یاران مہربان
بنشستہ و شراب مروق چشیدہ گیر
ہر نعمتے کہ ہست بعالم تو خوردہ داں
ہر لذتے کہ ہست سراسر چشیدہ گیر
چوں بادشاہ عدل تو بر تخت سلطنت
صد نو جامہ حریر بدولت دریدہ گیر
ہر گنج و ہر خزانہ کہ شاہاں نہادہ اند
آں گنج و آں خزانہ بچنگ آوریدہ گیر
آں بندہ را بسیم و زر خود خریدہ گیر
ہر ماہرو کہ ہست در ایام روزگار
آنرا بناز در بر خود آرمیدہ گیر
آواز عود و بربط و نائے و سرود و چنگ

ان طفلہ کے شنوی ہم شنیدہ گیر

دراو روئے آب حیات تو پر زلال

مانند خضر گرد جہاں در دویدہ گیر

تو ہمچو عنکبوتی و حال جہاں مگس

چوں عنکبوت گرد مگس بر تنیدہ گیر

گیرم ترا کہ مال زقاروں فزوں شود

عمرت بعمر نوح پیمبر رسیدہ گیر

چندیں ہزار اطلس و کمخواب روزگار

پوشیدہ در تنعم و آنگہ دریدہ گیر

روزے ببیں کہ ہیچ نماند بجز دریغ

صد بار پشت دست بدنداں گزیدہ گیر

سعدی تو نیز مثل قفس تنگنائے دہر

روزے قفس شکستہ و مرغش پریدہ گیر

ان کے سوا قصائد میں وہ خواجہ شمس الدین جوینی ۔ مجد الدین رومی ۔ خواجہ علاء الدین انکیانو وغیرہ کی مدح میں ہیں ۔ مگر ان میں مدح کی چاشنی برائے نام ہے ۔ دو چار شعر مدح کے کہہ کر وہی پند و موعظت کو شروع کر دیا ۔ مثلاً وہ قصیدہ ملاحظہ کیجئے جو انکیانو کی مدح میں ہے جس کا مطلع ہے ؎

بس بگردید و بگردد روزگار

دل بدنیا در نہ بندد ہوشیار

اسی قصیدہ میں شیخ لکھتا ہے ؎

"نام نیک رفتگان ضایع مکن"

"تا بماند نام نیکت برقرار"

"ملک باناں رانشاید روز وش"

"گاہے اندر خمر و گاہے در خمار"

"کار مسکینان و درویشاں برار"

"تا ہمہ کارت برارد کردگار"

"با غریباں لطف بے اندازہ کن"

"تا بماند نام نیکی در دیار"

شیخ کا جو عربی کلام ہے اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ کسی ایرانی کا لکھا ہوا ہے بلکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک خاص عربی نژاد ممبر پر کھڑا ہوا وعظ کہہ رہا ہے شیخ کی عمر کا ایک بڑا حصہ دیار عرب میں بسر ہوا تھا اسلئے عربی زبان اُسکو بمنزلہ مادری زبان کے ہو گئی تھی قطع نظر اس سے اُس نے اپنی عمر دینیات تصوف علم ادب کے مطالعہ میں صرف کی تھی اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک مشاق اور ماہر ادیب و زباندان ہو گیا تھا اور اُسکو عربی زبان پر اسقدر کمال تھا کہ فارسی لکھتے لکھتے وہ ایک برجستہ مصرع اور شعر عربی کا ایسا بے تکلف کہہ جاتا تھا کہ اس سے عبارت میں جان پڑ جاتی تھی اور شاعری کا رتبہ دوبالا ہو جاتا تھا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کو بھی اپنی تحریر پر ناز تھا چنانچہ بغداد کے مرثیہ میں وہ معمولی کسر نفسی کے بعد لکھتا ہے کہ میرے کلام میں وہ جادو ہے جو بابل میں تھا ؎

وما الشعر او والله لست بکالع

ولو کان عندی ما ما بابل من سحر

بڑے بڑے "کریٹک" اور سخن شناس کہتے ہیں کہ شیخ کا نعتیہ قطعہ

بلغ العلیٰ بکمالہ　　کشف الدجیٰ بجمالہ

حسنت جمیع خصالہ　　صلوا علیہ وآلہ

اس رتبہ اور اس شان کا ہے کہ اس سے بہتر کوئی نہیں کہہ سکتا۔

شیخ کے مرثیے نہایت دردناک اور رقت انگیز ہیں۔ شیخ متنبی اور بحتری کے سوز و گداز کا لذت چشیدہ تھا اس نے بیکسی اور بے کسی کی چاشنی

چکی تھی اس نے سلطنتوں کے پے در پے انقلاب اور ملکوں کے متواتر تغیرات
دیکھے تھے اس نے مظلوموں کے بین اور بیوہ عورتوں کے شور و شیون سنے تھے
اسلیے اُسکے مرثیوں سے جن میں اُس نے درحقیقت دل کھول کے سوگ کیا ہے
اور خاطر خواہ دُکھڑا رویا ہے سُننے اور پڑھنے والوں کے شیشۂ دل پر ٹھیس لگتی ہے
اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں ٭

شیخ کے ایک مرثیہ پر لوگوں نے اعتراض بھی کیا ہے یعنی شیخ نے چنگیز خاں کے
لڑکے ہلاکو خاں کی خونریزی اور مستعصم باللہ کی تباہی اور سلطنت عباسیہ کے
زوال کا حال مستعصم باللہ کے ایک نہایت دردناک مرثیہ میں لکھا ہے۔ لوگ
یہ کہتے ہیں کہ مستعصم باللہ ایک نالائق ظالم تھا جو شمر اور ناشدنی خلیفہ
تھا جس کا دماغ تکبر اور غرور سے مختل ہو گیا تھا اس زمانہ میں اہل سُنت
کی حمایت اور طرفداری میں کرخ کے بنی ہاشم پر وہ ظلم ہوا جو انگلینڈ میں خونخوار
میری ملکہ انگلستان کے عہد میں اور بار تھلمیو کے دن فرانس میں فرقہ پروٹسٹنٹ
کے عیسائیوں پر ہوا تھا اس مرثیہ کے چند اشعار ہم بطور نمونہ درج کرتے ہیں ۔۔

آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمیں
بر زوال ملک مستعصم امیرالمؤمنیں
اے محمد گر قیامت می برآری سر ز خاک
سر برآور وین قیامت درمیان خلق بیں
نازنیناں حرم را خون خلق نازنیں
زآستاں بگذشت و ما را خون دل از آستیں
زینہار از دور گیتی و انقلاب روزگار
در خیال کس نگشتی کانچناں گردد چنیں
دیدہ بردار اے کہ دیدی شوکت بیت الحرام
قیصران روم سر برخاک و خاقاں بر زمیں

خوں فرزندان عم مصطفی شد ریختہ
ہم بر آں خاکے کہ سلطاناں نہادندے جبیں
بعد ازاں آسایش از دنیا نباید چشم داشت
قیر در انگشتری ماند چو برخیزد نگیں
دجلہ خونابست زیں پس گر نہد سر در نشیب
خاک نخلستان بطحا را کند با خون عجیں
نوحہ لایق نیست بر خاک شہیدان زانکہ ہست
کمترین دولت مر ایشاں را بہشت برتریں
لیکن از روے مسلمانی و در راہ مرحمت
مہرباں را دل بسوزد در فراق نازنیں
باش تا فردا کہ بینی روز داور رستخیز
کز لحد با روے خوں آلودہ برخیزد حزیں

* * * * * * * * * *

* * * * * * * * * * *

روزگارت با سعادت باد و سعدی مدح گو
رایتت منصور و بختت یار و اقبالت قریں

اگر فرض بھی کر لیں کہ معتصم اللہ اول درجہ کا نالایق اور ناشدنی تھا مگر پھر کہنا پڑتا ہے کہ اُسکے بگڑنے سے نہ صرف بنی عباس کی سلطنت کا چراغ [illegible] گل ہو گیا بلکہ اہل عرب کا اقتدار صفحۂ ہستی سے مٹ گیا اور وہ درخت جس کا بیج خلفاے راشدین نے اپنے ہنرمند ہاتھوں سے بویا تھا چشم زدن میں جڑ بن سے اکھڑ گیا پس شیخ نے مستعصم باللہ کا مرثیہ نہیں کہا بلکہ خود [illegible] مرثیہ کہا تھا اس لیے یہ اعتراض تعصب اور کم نظری کے باعث سے ہے اس سے شیخ پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔

دست [illegible] بر مے آید — [illegible] بر مے آید
بیدار نشستہ ام نظر بر سر کوہ — تا صبح کے از [illegible] بدر مے آید

شبہا ز ہمہ خلق نہاں میگریم — چشم از غم دل بر آسماں میگریم
حاصل از عمر رفتہ چوں گریہ بود — بر عمر گذشتہ ہمچناں میگریم

فرد

پائے ملخے نزد سلیماں بردن — عیب است ولیکن ہنر است از مورے

سلطاں چو بمنزل گدایاں آید — گر بر سر بوریا نشیند شاید

نہالے کہ بسی سال گردد درخت — بہ بیخش برآرد یکے باد سخت

تواضع گرچہ محمودست و فضل بیکراں دارد — نشاید کرد بیش از حد کہ ہیبت را زیاں دارد

گر بندہ ات کسے دہد دشنام — بہ کہ ساکن دہی جواب سلام

کوتہ نظراں را نبود جز غم خویش — صاحب نظراں را غم بیگانہ و خویش

شیخ کی کلیات میں ایک مجموعہ ہزلیات بھی ہے جسکی نسبت لوگوں نے عجیب عجیب خیالات ظاہر کیے ہیں بعض کہتے ہیں کہ یہ مجموعہ شیخ کے دامن کمال پر ایک بدنما دھبہ ہے بعض کہتے ہیں کہ شیخ کی شخصیت اور تقدس سے بعید تھا کہ ایسا پھکڑ ہوتا۔

جان پینس صاحب لکھتے ہیں کہ شیخ کی ہزلیات اس قدر فحش [illegible]

ان سے شیخ سخت قابلِ الزام ٹھیرتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ کچھ شک نہیں کہ ان ہزلیات میں بیحیائی کا منہ کھلا ہے اور شرم کی آنکھیں بند ہیں مگر شیخ کا اس میں ذرہ بھر بھی قصور نہیں تھا۔ اس مجموعہ کے شروع میں لکھتا ہے:

الزمنی بعض ابناء الملوک ان اصنف له کتاباً فی الهزل علی الطریق السوزنی فاذا اجبه توعدنی بالقتل فلاجل ذالک اجبت امره و انشدت هذا الابیات وانا استغفر اللّٰه العظیم ۔

یعنی ایک بادشاہزادہ نے مجھے اس بات پر مجبور کیا کہ میں ایک کتاب ہزلیات کے طریق پر لکھوں میں نے انکار کیا، اس پر اس نے مجھے قتل کی دھمکی دی اور مجھے لاچار سنانا پڑا اور لاچار یہ اشعار لکھے اور میں خدائے بزرگ سے توبہ و استغفار کرتا ہوں۔ مثل مشہور ہے مرتا کیا نہ کرتا۔ اگر شیخ نے جان بچانے کے لئے یہ بیہودہ ہزل تک لکھے تو یہ کیا گناہ کیا۔ جان کا بچانا ہر فرد بشر پر لازم ہے۔ علاوہ اس کے ان ہزلیات میں شیخ کی جادو بیانی اور لطافتِ خیالات کوسوں معدوم ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اگر شیخ کا کلام ہے تو شیخ نے یہ ہزلیات کراہت اور نفرت کے ساتھ عالمِ مجبوری میں لکھی ہیں۔ باوجود اس کے اگر کوئی شیخ کی تقدس مآبی پر ان ہزلیات کے بہانہ نکتہ چینی کرے تو وہ تعصب سے معذور ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر شیخ نے یہ مجموعہ عالمِ مجبوری میں نہ بھی لکھا تھا تو بھی ہم ان پر الزام نہیں لگا سکتے تھے۔ وہ بشر تھا، فرشتہ نہ تھا اور بشر کسی حالت میں بشریت سے خالی نہیں ہے۔ بے عیب صرف ذاتِ خدا کی ہے۔ جہاں پھول ہے وہاں خار بھی ہے [illegible] ہے وہاں اندھیرا بھی ہے۔ اسی طرح جہاں شیخ کی دیگر تصانیف [illegible] بہا ہیں وہاں ان ہزلیات اور مضحکات کو عین کمال تصور کر لینا [illegible]

[illegible] یہ انگوٹھی جو لاہور میں عالمگیر کے بیٹے بہادر شاہ کا بڑا [illegible]

سلطر شوشتری تھا اپنی ایک ضخیم کتاب "گلشن ایران" میں لکھتا ہے "ہزلیات سعدی
کو دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ ایسا مہذب فاضل کبھی ایسے فحش اور ہزل کو پسند
نہیں کرسکتا۔ مگر تحقیق سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ شرارت نورجہاں کی
ہے اس نے چند شیرازیوں کو پوشیدہ بلاکر یہ ہزلیات کہلوائیں اور سعدی
کی تصنیفات کے ساتھ شریک کردیا جسکی شہرت اور عظمت تمام ہندوستان
و ایران میں پھیل رہی ہے جو لوگ کہ اس مشورہ میں نورجہاں کے ساتھ شریک
تھے ان میں سے مجھے صرف دو کا نام معلوم ہوا ہے۔ ایک کو علی نقی اور دوسرے
کو علی حید کہتے تھے۔ ان دونوں شرارت پیشہ انفاس نے ہزلیات بڑی کوشش
سے ایک بڑی جماعت کے مشورہ سے تصنیف کیں اور ہزاروں روپے لکھوا کر
دیگر نقل کرائیں اور مختلف ملکوں میں تقسیم کرادیں۔ یہ مجھے تحقیق ہوا ہے کہ پہلے
سعدی کی ہزلیات کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ نورجہاں کے وقت سے یہ صورت
پیش آئی ہے یعنی نورجہاں نے جو کٹی شیعہ تھی یہ تجویز اس لئے نکالی کہ
سعدی پر جو سنت جماعت تھا۔ تبرے کہنے کا موقع لوگوں کو ہاتھ آجائے۔"

سید انشا نے جو ایک مشہور شاعر اردو زبان کا ہوا ہزلیات کی نسبت یوں
رائے زنی کی ہے "جہاں تک میں نے تحقیق کیا ہے مجھے یہ نہیں معلوم ہوا کہ
ہزلیات شیخ سعدی کی ہیں۔ اسلئے کہ علاوہ مورخوں کی بے تعداد شہادتوں
کے علما ایک نظر ہزلیات کی نظم و نثر اور عربی عبارت پر بھی ڈالنی چاہیے
جس قدر کلام ہے۔ سب بے ربط اور خلاف محاورہ پارسی ہے اگر اسکو
بامحاورہ بھی کہیں تو یہ زبان نہایت کرخت اور اس میں بہت سے محاورے
ایسے ہیں کہ وہ اس زمانہ میں رائج نہ تھے معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر کے میر منشی
نعمت خاں عالی نے یہ حکمت کی ہے کہ مذہبی دشمنی کی وجہ سے اس نے بدنام
کردینے کیلئے سعدی کے دامن عزت پر یہ دھبہ لگایا ہے۔"

پندنامہ یعنی کریما اگرچہ نفس مضمون کے خیال سے اعلیٰ درجہ کی کتاب

اخلاقی ہیں بہت کم ایسی ہیں جو وعظ و نصیحت اور عاشقانہ مضامین سے جو شیخ کے دوسرے کلام میں ہے۔ میرے خیال میں یا تو شیخ نے دیدہ و دانستہ اسکو کم سن بچوں اور نو عمر لڑکوں کے لئے ایسا بنایا ہے یا انحطاط طبیعت کی حالت میں کہا ہے۔ شاعر کا خیال کسی وقت اوج عیوق پر ہوتا ہے تو کسی وقت تحت الثریٰ میں اور ہمیشہ اس شعر کا مصداق ہوتا ہے ؎

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم
گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

شیخ کی نظم میں بوستان سب سے زیادہ مشہور ہے میرے خیال میں شاہنامہ کے سوا اور کوئی کتاب بوستان سے زیادہ فارسی نظم میں مقبول نہیں ہوئی بوستان کی شہرت اور مقبولیت ایران، ترکستان، تاتار، افغانستان اور ہندوستان ہی تک محدود نہیں بلکہ یورپ میں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے اولے اریس نے بوستان کا ترجمہ جرمن میں کیا۔ اس کے بعد اچ گراف نے بوستان کا ترجمہ جرمن میں [illegible] میں کیا یہ دو جلدوں میں تھا اور اس کا نام اس نے لسٹ گارٹن رکھا بوستان کا ترجمہ انگریزی میں کپتان ایچ کلارک رائل انجینیر نے ۱۸۷۹ء میں نہایت عمدہ اور مفصل کیا ہے اور حال میں میجر سکنن نے بوستان کی چیدہ حکایات کا ترجمہ انگریزی نظم میں کیا ہے اور اس کا نام فلاورز فرام دی بوستان رکھا ہے اگرچہ بوستان نے اعلیٰ درجہ کی مقبولیت حاصل کی ہے اور جہاں تک ہمارے فہم کا دخل ہے یہ کتاب عیوب سے مبرا ہے پھر بھی اس برگزیدہ خلائق نے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ بوستان کے دیباچہ میں لکھا ہے ؎

تو نیز ار بدی بینیم در سخن — بخلق جہاں آفرین کار کن
چو بیتے پسند آیدت از ہزار — بمردی کہ دست از تعنت بدار

بوستان شیخ نے ۶۵۵ھ میں تصنیف کی۔ جیسا کہ اس نے دیباچہ

بدانش گردش کن بے بلا کہ سنگ ہمیں ہردو پیاں بخورد
برآں مرد کندست دندان تیز کہ مار زبان پیچش و دروغ

(۳) بوستاں میں شیخ نے پند و موعظت میں کہیں کہیں ظرافت اور خوش طبعی کے نمک کی چاشنی بھی دیکر کلام کو چٹ پٹا اور مرغوب طبع بنا لیا ہے مثلاً

حکایت

مرا حاجیے شانہ عاج داد کہ رحمت بر اخلاق حجاج باد
شنیدم کہ باری سگم خواندہ بود کہ از من بنوعے دلش رنجہ بود
بینداختم شانہ کیں استخواں نبایدم دیگر م سگ مخواں
مپندار چوں سرکہ خود خورم کہ جور خداوند حلوا برم
قناعت کن اے نفس بر اندکے کہ سلطان و درویش بینی یکے
چرا پیش خسرو بخواہش روی چو یکسو نہادی طمع خسروی

(۴) بوستاں میں شیخ نے ریاکاروں اور زمانہ سازوں کی خوب ہی گفش کاری کی ہے جو لوگ دکھاوے کیلئے عابد و زاہد بنجاتے ہیں انہیں خوب ہی آڑے ہاتھوں لیا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ اسکی پھبتیں فقیہوں اور واعظوں کی طرح تلخ اور بدمزہ معلوم نہیں ہوتیں اور حدود شرع میں بھی محدود رہتی ہیں مثلاً

حکایت

شنیدم کہ مردے براہ حجاز بہر خطوہ کردے دو رکعت نماز
چناں گرم رو در طریق خدا کہ خار مغیلاں نکندے ز پائے
بآخر ز وسواس خاطر پریش پسند آمدش در نظر کار خویش
بتلبیس ابلیس در چاہ رفت کہ نتواں ازیں خوبتر راہ رفت
گرش رحمت حق نہ دریافتے غرورش سر از جادہ برتافتے
یکے ہاتف از غیب آواز داد کہ اے نیک بخت مبارک نہاد
مپندار گر طاعتے کردۂ کہ نزلے بدیں حضرت آوردۂ

بہ ہمسایہ آسودہ گر ران ودلے بہ ازدلق رنگست بر منزلے

(۵) جہاں کہیں تشبیہ یا استعارہ استعمال کرتا ہے وہاں نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے زود فہم اشیاء کو انتخاب کرتا ہے تاکہ اس سے عبارت مبہم نہ ہو جائے بلکہ مضمون کا زور دوبالا ہو جائے مثلاً

رعیت چو بیخ است و سلطان درخت

درخت اے پسر باشد از بیخ سخت

(۶) مبالغہ کو حد اعتدال سے تجاوز نہیں ہونے دیا مثلاً

میانے دو کس دشمنی بود و جنگ سر از کبر بر یکد گر چوں پلنگ

ز دیدار ہم تا بحدے نزماں کہ بر ہر دو تنگ آمدے آسماں

(۷) شیخ نے قانون قدرت کو تعلیم اخلاق کے لئے ذریعہ ٹھیرایا تاکہ نصیحت جلد دل نشین اور کارگر ہو مثلاً

پلیدی کند گربہ بر جائے پاک چو زشتش نماید بپوشد بخاک

تو آزادی از ناپسندیدہ ہا نترسی کہ بروے فتند دیدہ ہا

(۸) شیخ نے حسن تاویل اور لطف استدلال کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ نبھایا ہے مثلاً

شنیدی کہ در روزگار قدیم شدے سنگ در دست ابدال سیم

نپنداری ایں قول معقول نیست چو قانع شدی سیم و سنگت یکیست

بادی النظر میں یہ بات فوق العادت معلوم ہوتی ہے کہ ابدال کے ہاتھ میں پتھر چاندی ہو جاتے ہیں مگر شیخ نے اسکی نہایت خوبی کے ساتھ تاویل کی ہے کہ جو لوگ قانع ہوتے ہیں ان کے نزدیک پتھر اور چاندی میں فرق نہیں ہوتا۔

(۹) شیخ نے واقعات کا بیان اس حسن و لطافت کے ساتھ کیا ہے کہ جس سے اس واقعہ کی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے مثلاً

چناں قحط سالے شد اندر دمشق کہ یاراں فراموش کردند عشق

چناں آسماں بر زمیں شد بخیل | کہ لب تر نکردند زرع و نخیل
بخوشید سرچشمہ ہائے قدیم | نماند آب جز آب چشم یتیم
نبودے بجز آہ بیوہ زنے | اگر برشدے دودے از روزنے
چو درویش بے برگ دیدم درخت | قوی بازواں سست و درماندہ سخت
نہ در کوہ سبزی نہ در باغ شخ | ملخ بوستاں خوردہ و مردم ملخ

شیخ کی تمام تصنیف میں سے گلستاں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ابھی اس کو
شیخ کے تمام کلام کا خلاصہ، ست اور عطر کہنا چاہیے۔ میرے خیال میں فارسی
یا انگریزی زبان میں کوئی کتاب گلستاں سے بڑھ کر مقبول نہیں ہوئی۔ ایشیا
میں یہ کتاب اس قدر مطبوع خاص و عام ہے کہ بچپن سے لیکر بڑھاپے
تک اس کے مطالعہ کا شوق رہتا ہے۔ گلستاں کی عظمت کا بہت عمدہ ثبوت
یہ ہے کہ تقریباً یورپ اور ایشیا کی ہر زبان میں اس کا ترجمہ ہوا ہے باوجودیکہ
اس میں نہ تو عجیب و غریب افسانہ ہیں۔ نہ گل و بلبل کے ترانہ ہیں۔ نہ غزلیات
عاشقانہ ہیں۔ نہ قوال ہوشانہ ہیں پھر بھی لوگ اسپر دل و جان سے فدا ہیں
اسکے اشعار لوگوں کو ازبر ہیں اور اسکے چھوٹے چھوٹے فقرہ معاملات روزمرہ
میں استعمال کرتے ہیں۔ جہاں تک ہم کو دریافت ہوا ہے گلستان کے ترجمہ
مفصلہ ذیل زبانوں میں ہوئے ہیں:۔

(۱) جنٹس نے گلستاں کا ترجمہ لیٹن (لاطینی) زبان میں کیا جو ایمسٹرڈم میں چھپا
(۲) مانسیر ڈوریر کانسل مقیم اسکندریہ نے گلستاں کو فرنچ زبان میں ترجمہ کیا
اور یہ ترجمہ سنہ ۱۶۳۴ء میں پیرس میں چھپا۔
(۳) مانسیر گاڈین نے سنہ ۱۷۸۹ء میں گلستان کو فرنچ میں ترجمہ کیا۔
(۴) سمالٹ صاحب نے سنہ ۱۸۸۹ء میں گلستاں کو فرنچ میں ترجمہ کیا۔
(۵) [illegible] اولیرس نے گلستان کو جرمن میں ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ باتصویر ہے

(۵) سنہ ۱۶۵۲ء میں ہیمبرگ میں شائع ہوا۔

(۶) ایچ گراف نے سنہ ۱۸۴۶ء میں گلستاں کو جرمن میں ترجمہ کیا۔

(۷) سنہ ۱۷۳۷ء گلستان کا ترجمہ فرنچ زبان میں ہوا۔

(۸) مسٹر گلیڈون نے سنہ ۱۸۰۸ء میں اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔

(۹) راس صاحب نے ایشیاٹک سوسائٹی لنڈن کی فرمایش سے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔

(۱۰) ایسٹوک صاحب نے سنہ ۱۸۵۲ء میں گلستان کا ترجمہ ہرٹ فورڈ سے شائع کیا اس ترجمہ میں یہ خوبی ہے کہ نثر کا ترجمہ نثر میں اور نظم کا ترجمہ نظم میں کیا گیا ہے۔

(۱۱) سنہ ۱۸۸۰ء میں جان پلیٹس انسپکٹر مدارس ممالک متوسط نے گلستاں کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا اور شروع میں حیات سعدی بھی لکھی ہے۔

(۱۲) ہندوستان میں سب سے پہلے میر شیر علی افسوس نے مارکوئیس آف ولزلی کے عہد میں گلستاں کا اردو میں ترجمہ کیا۔

(۱۳) ایک بنگالی نے اس کا ترجمہ بنگالی میں کیا ہے۔

(۱۴) ایک پارسی مسٹر ... نے اس کا ترجمہ گجراتی میں کیا ہے۔

(۱۵) پنڈت ... نے گلستاں کو فارسی سے بھاشا میں ترجمہ کیا ہے۔ اور اس کا نام بشوپ ... رکھا ہے۔

(۱۶) علاوہ ان ترجموں کے گلستاں کے کئی اڈیشن مختلف یورپین عالموں نے چھپوائے ہیں۔ ان سائیکلوپیڈیا برٹینکا میں لکھا ہے کہ مسٹر ہیرنگٹن نے سنہ ۱۷۹۱ء میں کلیات سعدی چھپوائی تھی۔

(۱۷) اکثر فضلاء و علماء نے شیخ کے اشعار کا ترجمہ عربی میں کیا ہے۔ فضل اللہ بن عبداللہ شیرازی نے تاریخ وصاف میں لکھا ہے۔

فقلت لہ حل ... مضمرہ و مضمر

فالی من ... سکرین ...

لجاءت بالتی کنت ضیاً مسدلا
فجالست للورد الجنی بمهد
فانز فی خلقی کمال مجالسی
والا انا التراب الذی کنت فیہ

یہ شیخ کے مفصلۂ ذیل قطعہ کا ٹھیک ترجمہ ہے ؎

گلے خوشبوئے در حمام روزے | رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری | کہ از بوئے دلآویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم | ولیکن مدتے با گل نشستم
جمال ہمنشیں در من اثر کرد | وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

(۱) جبرئیل نامی ایک مصر کے ادیب نے گلستان کا ترجمہ فصیح عربی میں کیا
اور وہ التزام کیا نثر کا ترجمہ نثر میں اور نظم کا نظم میں کیا ؛
(۲) سلطان حمید کے بھائی رشاد پاشا نے گلستان کا ترجمہ ترکی زبان میں کیا ؛
(۳) قطع نظر ان کے سینکڑوں اور ترجمے گلستان کے ہوئے ہیں مثلاً سنا جاتا
ہے کہ حال میں روسی زبان میں بھی اس کا ترجمہ ہوا ہے ؛
پیشتر اسکے کہ ہم گلستان کی چند خوبیاں بیان کریں جس کے باعث یہ
نہایت مقبول ہوئی ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ چند مشاہیر کی آراء کا خلاصہ
گلستان کے بارہ میں یہاں بہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے ؛

امیر حسن دہلوی فرماتے ہیں ؎

حسن گلے ز گلستان سعدی آوردہ است
کہ اہل دل ہمہ گلچیں آں گلستان اند

سرگور اوسلی صاحب لکھتے ہیں گلستان کا ترجمہ جو کہ مشہور فاضل جنٹس نے لاطینی

میں کیا تھا۔ اس نے مدتوں یورپ کے اہل علم و ادب کو شیخ کے خیالات پر
فریفتہ کیا ہے۔

پلیٹس صاحب لکھتے ہیں کہ وہ کتاب جسکی بدولت سعدی شیرازی نے
بقائے دوام اور شہرت عام کا تاج سر پر رکھا گلستان ہے۔

سر ولیم اوسلی صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں کہ شیخ کی شہرت ایک عالیشان
عمارت ہے جسکی بنیاد گلستان ہے۔

سر رابرٹ بینگ صاحب لکھتے ہیں کہ سعدی بلا کا لکھنے والا شخص ہے
چنانچہ اسکی تصنیف کے تتبع اور تقلید کی سینکڑوں نے کوشش کی ہے مگر
ایک کو بھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

قاآنی نے پریشان کے دیباچہ میں گلستان کی نسبت لکھا ہے "شیخ کی
گلستان ایک باغ ہے جسکے ہر پھول کی ایک ایک پتی کے ہزاروں بلبل عاشق
ہیں اور ہر بلبل عشق کی جان قیامت تک اسکی حیات بخش شبنم سے زندہ ہے"۔

ہمارے ملک میں مدارس اور مکاتب دونوں کے طلبا کیواسطے گلستان سے
بڑھکر کوئی کتاب مفید نہیں۔ گلستان بچوں کے لئے استاد شفیق ہے۔ جوانوں
کے لئے شیخ مشفق اور بوڑھوں کے لئے یار روزگار ہے۔ گلستان ہر زمانہ میں
ہر دلعزیز رہی اور اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو قرآن حمید اور بائبل کے
بعد جو شہرت گلستان نے حاصل کی ہے وہ کسی کتاب کو نصیب نہیں ہوئی۔
الغرض گلستان الف سے لیکر یے تک خوبیوں سے بھری ہوئی ہے لیکن
ہم چند خاص خوبیاں بطور نمونہ اس جگہ درج کرتے ہیں۔

اول۔ گلستان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے ہزارہا جملے اشعار اور مصرع
ضرب المثل ہو گئے ہیں مثلاً

(۱) ـــ حاجت مشاطہ نیست روئے دلارام را۔

(۲) ـــ عاقبت گرگ زادہ گرگ شود۔

(۳) آنانکہ غنی ترند محتاج ترند ؎

(۴) کوفتہ را نان تہی کوفتہ است ؎

(۵) کو خویشتن گم است کرا رہبری کند ؎

(۶) باطل است آنچہ مدعی گوید ؎

(۷) عطائے تو بہ لقائے تو بخشیدم ؎

(۸) مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں ؎

(۹) بدوزد طمع دیدۂ ہوشمند ؎

(۱۰) نماز برآں کن کہ خریدار تست ؎

(۱۱) نہ محقق بود نہ دانشمند ؎
چارپائے برو کتابے چند ؎

(۱۲) مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید ؎

(۱۳) پراگندہ روزی پراگندہ دل ؎

(۱۴) قدر عافیت کسے داند کہ بمصیبتے گرفتار آید ؎

(۱۵) مور ہماں بہ کہ نباشد پرش ؎

(۱۶) گربہ مسکیں اگر پر داشتے ؎
تخم گنجشک از جہاں برداشتے ؎

(۱۷) کس نیاموخت علم تیر از من ؎
کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد ؎

(۱۸) دشمن چہ کند چو مہرباں باشد دوست ؎

(۱۹) در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس ؎

(۲۰) صیاد نہ ہر بار شکارے ببرد ؎
باشد کہ یکے روز پلنگش بدرد ؎

(۲۱) خطائے بزرگاں گرفتن خطاست ؎

(۲۲) آنچہ بسیار خوار است بسیار خوار ؏

(۲۳) برد گُنہ کاران بالغ باشد و بس ؏

(۲۴) میراث پدر خواہی علم پدر آموز ؏

(۲۵) اندک اندک شود بہم بسیار ؏

(۲۶) جور استاد بہ از مہر پدر ؏

(۲۷) خاک شو پیش از انکہ خاک شوی ؏

(۲۸) دشمن نتوان حقیر و بیچارہ شمرد ؏

(۲۹) سر اندازی سر خویش گیر ؏

(۳۰) اگر خاکی نباشد آدمی نیست ؏

دوم - گلستاں کی عبارت اس شان و شوکت کی ہے کہ اسکی فصاحت اور بلاغت کے سامنے بڑے بڑے استادوں نے سر جھکایا ہے اور بڑے بڑے منشیوں نے اُسکے تتبع سے عاجز رہنے کا اقرار کیا ہے مثلاً از بستر رنجش برخاستم گرسنہ نشانند نہ ایسا فقرہ لکھنا ہر ایک کا کام نہیں ہے ؏

سوم - گلستاں کی بنیاد محض اخلاقی پند و موعظت پر رکھی گئی ہے اور یہ مضمون ہمیشہ پھیکا سا ہوتا ہے بلکہ اکثر ذائقوں کو تلخ معلوم ہوتا ہے اس لئے اکثر مصنف اسپر ناول ناٹک کی چاشنی چڑھا کر یا فرضی قصوں کا نمک مرچ لگا کر خوشگوار بناتے ہیں شیخ نے گلستاں میں صاف اور کھلم کھلا طور پر نصیحت کی ہے اور پھر اس سادگی میں وہ لطف رکھا ہے کہ اسکا کلام مطبوع طبائع خاص و عام ہوا ہے ؏

چہارم - گلستاں کے اشعار - فقرات اور ابیات کو اکثر منشیوں نے اپنی تصانیف میں بطور کوٹیشن استعمال کر کے اپنے کلام کو زینت دی ہے ؏

پنجم - گلستاں میں شیخ نے غلو اور اغراق سے حتی المقدور اجتناب کیا ہے اور فوق العادت باتوں سے خصوصیت کے ساتھ پرہیز کیا ہے ؏

ششم - اگرچہ نصف سے زیادہ گلستاں کے فقرے مسجع و مقفٰے ہیں مگر یہ صنعت

لطف آمد ہے۔ نیز کلیے اور وہیں یعنی اس نے بے سلیقہ یہ زور ڈال کر نشست بیانی
نہیں کی ہے بلکہ جودتِ طبع سے جو بات خود بخود ذہن میں آئی ہے وہی بے ساختہ
لکھ ڈالی ہے۔

ہفتم۔ شیخ نے گلستان میں بال کی کھال کھینچی ہے اور تمام باتوں سے دقیق
معنی اخذ کئے ہیں اور دقیق باتوں کو ایسے پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ معمولی سمجھ
کے آدمی بھی انہیں سمجھ سکتے ہیں۔

ہشتم۔ گلستان میں شیخ نے ناتوان قدرت کو تعلیم و تربیت کا ذریعہ ٹھہرایا ہے۔

نہم۔ گلستان میں شیخ نے یہ خوبی رکھی ہے کہ جب کسی خاص فرقہ کو اس کے
عیوب پر متنبہ کرنا چاہا ہے تو اپنے آپ کو مشار الیہ بنا کر اپنی ہی سرگزشت لکھنی
شروع کر دی ہے۔ چنانچہ اس حکمت عملی سے اُس کی کتاب ہر فرقہ اور ہر گروہ میں
ہردلعزیز ہو گئی ہے اور اس میں جو نصیحتیں درج ہیں وہ کسی کو بھی کڑوی اور
ناگوار نہیں معلوم ہوتیں۔

دہم۔ مختصر فقروں کی برجستگی۔ الفاظ کی شستگی۔ استعارات کی نفاست اور
تشبیہات کی لطافت۔ بندش و طرز کی خوبی۔ اور مضامین کی ندرت اور طرز
حسن بیان اور لطف ادا حسن تاویل اور حکمت استدلال کی لیاقت کے لحاظ
سے گلستان ایک ایسا لہلہاتا ہوا سدا بہار باغ ہے جس میں سینکڑوں نہریں
دودھ اور شہد کی رواں ہیں۔ جس میں سینکڑوں فوارہ آبحیات کے چل رہے
ہیں۔ جس کے پتے پتے پر سینکڑوں بہشت نثار ہو رہے ہیں۔

دنیا میں دو قسم کے اشخاص ہیں۔ ایک تو حق پسند ہیں اور دوسرے وہ جو
حسد اور رشک کے پتلے ہیں جو خوبیوں کو دیکھ کر جل کر خاک ہو جاتے ہیں اور
ہمیشہ اسی تلاش میں رہتے ہیں کہ کوئی برائی نظر آئے تاکہ اُسے الم نشرح کر کے دل
ٹھنڈا کریں۔ چنانچہ اس قماش کے لوگوں نے چند اعتراض بھی گلستان پر
کئے ہیں۔ ہماری رائے میں یہ سب اعتراض واہی اور بے سر و پا ہیں۔

طن روشن ہوگئیں۔ وہ قریب تھا کہ شکاری پر حملہ آور ہو اور ایک دو سکنڈ میں
اس کو پھاڑ ڈالے۔ مگر خوبیٔ قسمت سے وہاں ایک بھری ہوئی بندوق
رکھی تھی۔ جو شکاری نے اٹھالی اور چیتے کے منہ میں داغ دی اور جان
بچائی ورنہ کام تمام ہونے میں کوئی فرق نہ باقی تھا اس مثال سے ظاہر ہے کہ
"ناکس بتربیت نشود اے حکیم کس"۔

(۳) گلستان میں شیخ نے لکھا ہے کہ ؎

در استانہ سیمیں بمیخ زر بزنند
گمان مبر کہ یہودی شریف خواہد بود

یعنی یہودی کیسا ہی دولت مند ہو جائے شریف نہیں ہو سکتا۔ اس پر یہ اعتراض
ہے کہ اس بات سے کمال تعصب مترشح ہوتا ہے۔ ہم کہتے ہیں اس میں ذرہ
بھر بھی تعصب نہیں ہے کیونکہ یہودیوں سے ہر جگہ نفرت کیجاتی تھی چنانچہ کئی
بار وہ انگلستان سے جلاوطن کئے گئے۔ شکسپیر کا مشہور ڈراما شائیلاک جیو کا
ظاہر کرتا ہے کہ اس زمانہ میں یہودی کیسی نفرت کی نگاہوں سے دیکھے
جاتے تھے۔ اگر شیخ نے بھی ان کی نسبت یہ لکھ دیا۔ تو کیا برا کیا۔ اس زمانہ میں
یہودی ہر طرح کے افعال شنیعہ کرتے تھے اور ہر جگہ حقارت کئے جاتے تھے
قطع نظر اس کے فاتح قوم مفتوحہ قوم کو ہمیشہ حقیر ہی سمجھتی رہی ہے۔ اہل یورپ
کو دیکھو کہ آجکل باوصف اس قدر شائستگی کے ہندوستانیوں کو "کالا لوگ"
کہہ کر پکارتے ہیں۔

(۴) ایک یہ اعتراض ہے کہ سعدی نے گلستان میں لکھا ہے کہ "سرہنگے زادہ را دیدم
کہ بر در سرائے اغلمش ... الخ" اور اغلمش کوئی بادشاہ نہیں ہوا۔ ہم کہتے ہیں کہ
شاید اغلمش سے مراد التمش ہوگی اور اگر نہ بھی ہو تو سعدی کوئی تاریخ نہیں
لکھ رہا تھا کہ اس قسم کی باتوں کا پابند ہوتا۔

(۵) شیخ نے گلستان میں لکھا ہے کہ ایک مریض بادشاہ کے لئے بعض اطبا نے

ایسے آدمی کا پتا جو خاص صفات سے موصوف ہو تجویز کیا تھا معترض اسپر لال پیلے ہو کر یہ کہتے ہیں کہ یہ بات حال کی تحقیقات کے خلاف ہے ہم کہتے ہیں کہ اگر یہ اعتراض ہے تو ان طبیبوں پر ہے جنہوں نے یہ تجویز کی۔ شیخ تو صرف راوی تجویز ہے۔ قطع نظر اُس کے اگر شیخ نے پند و موعظت کے لئے ایک فرضی مثال درج کتاب کر دی تو کیا گناہ کیا۔ وہ علم حکمت و طبابت پر کتاب نہیں لکھ رہا تھا کہ اس سے کسی قسم کے ہرج کا احتمال ہو۔

(۶) شیخ نے گلستاں میں لکھا ہے ؎

راہِ راست برو اگرچہ دور است

زنِ بیوہ مکن اگرچہ حور است

اسپر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب بیوہ سے شرعاً شادی جائز بلکہ مستحسن ہے تو اس سے منع کرنے کے کیا معنی؟ ہم کہتے ہیں کہ شیخ کی گلستاں کوئی فقہ یا فتاویٰ نہیں ہے شیخ نے یہ نہیں کہا کہ بیوہ سے شادی کرنا گناہ ہے یا خدا اور رسولؐ کے حکم کے خلاف اس نے صرف اپنا ذاتی تجربہ بیان کیا ہے اسکی رائے یہ ہے کہ بیوہ سے شادی نہ کرو۔ چاہے وہ حور ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اُسنے تجربہ سے دیکھ لیا تھا کہ ہمیشہ بیوائیں اچھی بیویاں نہیں بن سکتیں اور شیخ کے اس قول نصیحت کی قدر وہی لوگ جانتے ہیں جو بیوہ سے نکاح کر کے مزہ چکھ چکے ہیں۔

(۷) گلستان میں ایک شعر ہے ؎

نہ بر اشتر سوارم نہ چو اشتر زیر بارم

نہ خداوند رعیت نہ غلام شہریارم

اس شعر پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ ناموزوں ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ ایسا شخص جس نے ہزاروں شعر کہ ڈالے کبھی ممکن ہے کہ عروض سے ناواقف ہو۔ یہ شعر بحر رمل مجنون فعلاتن فاعلاتن فعلاتن فاعلاتن میں ہے۔

اکثر دوست بن جاتے ہیں۔ مگر دوست وہی ہوتا ہے کہ مصیبت کے وقت کام آئے

نہ بینی کہ پیش خداوند جاہ ستایش کناں دست بر بر نہند
اگر روزگارش در آرد ز پائے ہمہ عالمش پائے بر سر نہند

ایضاً

دوست مشمار آنکہ در نعمت زند لاف یاری و برادر خواندگی
دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست در پریشاں حالی و درماندگی

(۸) کسی کا دل نہیں دکھانا چاہیے

بپرہیز از دود درونہائے ریش کہ ریش درون عاقبت سر کند
بہم بر مکن تا توانی دلے کہ آہے جہانے بہم بر کند

ایضاً

چراغیکہ بیوہ زنے بر فروخت بسے دیدہ باشی کہ شہرے بسوخت

ایضاً

تا توانی درون کس مخراش کاندریں راہ خارہا باشد
کار درویش مستمند بر آر کہ ترا نیز کارہا باشد

(۹) دوست کو اتنی قوت نہ دے کہ اگر دشمنی کرنے پر آئے تو تیرا کچھ بگاڑ نہ سکے۔

دوست را چنداں قوت مدہ
کہ اگر دشمنی کند تواند

(۱۰) اپنی لیاقت علمیت اور فضیلت پر نازاں نہیں ہونا چاہیے کیونکہ بخت و دولت تائید ایزدی کے بغیر حاصل نہیں ہوتی ہے

بخت و دولت بکاردانی نیست جز بتائید آسمانی نیست
کیمیاگر بغصہ مردہ و رنج ابلہ اندر خرابہ یافتہ گنج
او فتادست در جہاں بسیار بے تمیز ارجمند عاقل خوار

(۱۱) چغلخور، غیبت گو، اور ظالم کو عذاب لگتا ہے

... اور وہ شمرد

بیگماں عیب تو پیش دگراں خواہد برد

(۱۱) بری عادتوں سے پرہیز کرنا چاہئے ؎

خوئے بد در طبیعتے کہ نشست

نرود جز بوقت مرگ از دست

(۱۲) قناعت سے بڑھکر دنیا میں کوئی شے نہیں ؎

اے قناعت تو نگرم گرداں | کہ ورائے تو ہیچ نعمت نیست
کنج صبر اختیار لقمان است | ہر کرا صبر نیست حکمت نیست

(۱۳) کمینوں کا احسان نہیں اٹھانا چاہئے ؎

ہرچہ از دوناں بمنت خواستی | در تن افزودی و از جاں کاستی

ایضاً

اگر حنظل خوری از دست خوشخو | بہ از شیرینی از دست ترشرو

(۱۵) روپیہ اگر جمع کیا ہے تو اس کو کام میں لانا چاہئے اگر وہ کسی کام میں نہیں آتا تو اینٹ اور پتھر سے بدتر ہے ؎

"برائے نہادن چہ سنگے چہ زر است"

ایضاً

از زر و سیم راحتے برساں | خویشتن ہم تمتعے برگیر
چونکہ ایں خانہ از تو خواہد ماند | خشتے از سیم و خشتے از زر گیر

(۱۶) جبتک انسان خانہ نشین رہتا ہے اسکے تجربہ کو وسعت نہیں ہوتی ؎

تا بدوکان و خانہ درگروی | ہرگز اے خام آدمی نشوی
برو اندر جہاں تفرج کن | پیش ازاں روز کز جہاں بروی

(۱۷) خاموشی سے انسان بہت سی باز پرس سے محفوظ رہتا ہے اور یہ ایک نہایت عمدہ صفت ہے ؎

(۴۳) شہوت پرستی بہت بری ہے۔

کسے را کہ گردد زبان در دروغ
چراغ دلش را نباشد فروغ

(۴۴) بخیل کی حالت ہمیشہ قابل نفرت ہوتی ہے۔

بخیل ار بود زاہد بحر و بر ‌‌ بہشتی نباشد بحکم خبر
بخیلاں ز اموال برے خورند ‌‌ بخیلاں غم سیم و زر مے خورند

(۴۵) ضعیفوں پر ظلم و جور نہیں کرنا چاہئے۔

مکن بر ضعیفان بیچارہ زور
بیندیش آخر ز تنگئے گور

(۴۶) دنیا بے ثبات ہے۔ اسکی کسی بات پر تکیہ نہ کرنا چاہئے۔

ازیں پس مکن تکیہ بر روزگار ‌‌ کہ ناگہ زجانت بر آرد دمار

ایضاً

مکن تکیہ بر ملک دنیا و پشت ‌‌ کہ بسیار کس چوں تو پرورد و کشت

ایضاً

منہ دل دریں دیر ناپائدار ‌‌ ز سعدی ہمیں یک سخن یاد دار

(۴۷) جو شخص تمہیں ظاہرا بزرگ معلوم ہو اسکی عزت کرو غیب کا حال سوائے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا ہے۔

ہر کرا جامہ پارسا بینی ‌‌ پارسا دان و نیک مرد انگار
ور ندانی کہ در نہانش چیست ‌‌ محتسب را درون خانہ چہ کار

(۴۸) ہر بات کے لئے محل اور موقع دیکھنا چاہئے۔

نہ در ہر سخن بحث کردن رواست
خطائے بزرگاں گرفتن خطاست

(۴۹) کسی چیز میں دل نہیں لگانا چاہئے کیونکہ اس سے دل اٹھانا دشوار ہو جاتا ہے۔

(۵۴) اندازہ شناسی سے بے شتابہت اور زبان بیہودگی یا دشنام کی ہر شکل میں مدنظر رہنی چاہیئے

اگرت دور دار گوشہ نشینی بیا مگو فت دیکھ راہ پوش

(۵۵) بزرگوں کا نام ہمیشہ ادب کے ساتھ لینا چاہیئے

بزرگش نخوانند اہل خرد
کہ نام بزرگاں بزشتی برد

(۵۶) اپنے باپ دادا کا نام بدنام نہیں کرنا چاہیئے

نام نیک رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نام نیکت برقرار

(۵۷) بات کا انداز ان کو بڑا لحاظ چاہیئے جائے اگر دوسرے سامع کو تکلیف ہے اور حقیقت کا پیشتر یقین نہ ہو جائے کہنا نہیں کرنا چاہیئے

کمال است در نفس انسان سخن
تو خود را بگفتار ناقص مکن

(۵۸) ہر ایک چمکدار شے سونا نہیں ہوتی ہر ایک اصلیت اور حقیقت معلوم کرنے کے لئے تجربہ درکار ہے

توان شناخت بیک روز در شمائل مرد کہ تا کجاش رسیدست پایگاہ علوم
ولے ز باطنش ایمن مباش و غرہ مشو کہ خبث نفس نگردد بسالہا معلوم

(۵۹) جو انسان سعادتمند نصیحت کو بہت دوست رکھتے ہیں جسکو نصیحت سننے کا شوق نہیں ہے وہ لائق ملامت ہے

چوں نیاید نصیحتم در گوش
اگرت سرزنش کنم خاموش

(۶۰) وہ دوستی جو سالہا سال کی کمائی ہوئی ہو ذرا سی بات پر ضائع نہیں کرنی چاہیئے

(۹۸) ہمیشہ اپنے تدبیر کو اور دل کی حاظر رکھنی چاہئے ؎

تدبیاں خرد ہا بیفزائے قدر

کہ ہرگز نیاید ز پرورده غدر

(۹۹) بادشاہوں کو چاہئے کہ قیدیوں کے حالات بھی دریافت کرتے رہیں ؎

نظر کن در احوال زندانیان

کہ ممکن بود بے گنہ در میان

(۱۰۰) ہم کو چاہئے کہ دوست دشمن میں تمیز کرے ؎

نہ تدبیر محمود و رائے نکوست

کہ دشمن نماند شہنشہ دوست

(۱۰۱) جو خود ہی مر رہا ہو اسکو مارنا نہیں چاہئے کیونکہ اپنے سے کمزور پر ہاتھ اٹھانا نامردی میں داخل ہے ؎

مبا زور مندی مکن بر کہاں

کہ بر یک نمط مے نماند جہاں

(۱۰۲) جیسا کوئی کرے گا ویسا بھریگا ؎

ہمیں پند دادت اگر بشنوی

اگر خار کاری سمن ندروی

(۱۰۳) نصیحت جو غرض سے خالی ہو بعینہ کڑوی دوا ہے جس سے مرض دفع ہو جاتا ہے ؎

نصیحت کہ خالی بود از غرض

چو داروئے تلخ است دفع مرض

(۱۰۴) خوشامدی بھی کسی کا دوست نہیں ہوتا ؎

بتر دشمن آنکس نکو خواہ دانست

کہ گوید فلاں خار در راہ داشت

(١٧) جب دیکھو کہ دشمن پر زور نہیں چلتا تو حکمت عملی سے کام نکالو —

چو نتوان عدو را بقوت شکست

بباید به نعمت در فتنہ بست

(١٨) بیکسوں کی مدد کرنی چاہئے —

ز مسکینان آزادہ گیر	چو استادہ دست افتادہ گیر
جوانمردا اگر راست خواہی ولیست	کرم پیشہ شاہ مرداں علیست

(١٩) احسان سو عبادتوں سے بہتر ہے —

باحسان آسودہ کردن دلے

بہ از الف رکعت بہر منزلے

(٢٠) اگر ہو سکے تو امیدواروں کی امید بر لانی چاہئے —

بر آوردن حاجت امیدوار

بہ از قید بندی گسستن ہزار

(٢١) جب دیکھو کہ دشمن قابو میں آگیا ہے اور اس سے بھلائی کی کبھی امید نہیں ہو سکتی تو فرصت کو غنیمت سمجھو اور ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو اس کے شر سے بچاؤ —

چو گرگ خبیث آمدت در کمند

بکش ورنہ دل برکن از گوسفند

(٢٢) انسان دولت سے شریف نہیں ہو جاتا —

دنی بمال از کسے بہتر است	خر ار جل اطلس بپوشد خر است
گر بے ہنر بمال کند کبر بر حکیم	کون خرش شمار اگر گاو عنبر است

(٢٣) ترش رو اور بد خو ہمیشہ نفرت کیا جاتا ہے —

چو سنداں کسے سخت روئی نکرد	کہ خایسک تادیب بر سر نخورد
تو شیریں زبانی ز سعدی بگیر	ترش روے را گو بتلخی بمیر